محمد حفیظ کے ناولوں میں عصبیتوں اور امتیازات کی عکاسی: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو)

مقالہ نگار

محمد امجد

رجسٹریشن نمبر:267-FLL/MSURDU/F20

نگران

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

کلیۂ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

۲۰۲۳ء

K
Accession No. TH-27389

MS
891.439301
م ح م

اردو ادب - ناول - تنقید
اردو ناول - تحقیقی و تنقیدی جائزہ -
سماجی شعور

محمد حفیظ کے ناولوں میں عصبیتوں اور امتیازات کی عکاسی: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار

محمد امجد

رجسٹریشن نمبر:267-FLL/MSURDU/F20

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان و ادب

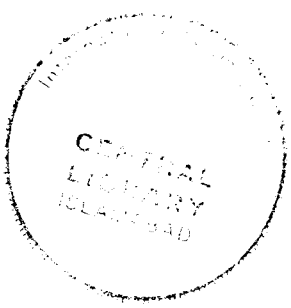

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور ایم ایس اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: "... کے ناولوں میں عصبیتوں اور امتیازات کی عکاسی: تحقیقی و ... جائزہ"

مقالہ ...

رجسٹریشن نمبر: ...7-FLL/...SURDU/F...

کمیٹی دفاعِ مقالہ

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)
آئی آئی یو اسلام آباد
اندرونی ممتحن

... نعیم مظہر

ڈاکٹر کامران ...
اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)
...

... پروفیسر
آئی آئی یو
نگران مقالہ

اقرار نامہ

میں محمد امجد، رجسٹریشن نمبر:267-FLL/MSURDU/F20 حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان **"محمد حفیظ کے ناولوں میں عصبیتوں اور امتیازات کی عکاسی: تحقیقی و تنقیدی جائزہ"** میں پیش کیا گیا کام میری ذاتی کاوش ہے اور سرقے سے پاک ہے۔ میں نے یہ کام بین الاقوامی اِسلامی، یونی ورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) کے سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گا۔

محمد امجد

مقالہ نگار

تصدیق نامہ

محمد امجد نے رجسٹریشن نمبر:267-FLL/MSURDU/F20 کے تحت اپنا تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو بعنوان **"محمد حفیظ کے ناولوں میں عصبیتوں اور امتیازات کی عکاسی: تحقیقی و تنقیدی جائزہ"** میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحن کو بھجوا دیا جائے۔

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

فہرست

باب اول : عصبیت اور امتیاز کا تعارف و پس منظر

باب دوم: ''ادھ ادھورے لوگ'' اور ''کرک ناتھ'' میں عصبیتوں اور امتیازات کی مختلف صورتیں

باب سوم: ''انواسی'' اور ''منتارا'' میں عصبیتوں اور امتیازات کی مختلف صورتیں

باب چہارم: محمد حفیظ کے ناولوں میں سماجی شعور اور ان کے ناولوں کا فنی جائزہ

مجموعی جائزہ:

کتابیات:

اظہار تشکر

شکر ہے اس پاک ذات کا جس کے قبضے میں میری جان ہے۔اس ہستی کے فضل و کرم سے مقالہ تکمیل پذیر ہوا۔ خاص طور پہ ڈاکٹر عزیز ابن الحسن صاحب کا ممنون ہوں۔ جن کی نگرانی میں یہ کام کیا ہے ان کی ابتداء سے اب تک ہر موقع پر میرا ساتھ دیا، ہر مرحلے پر ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی شاملِ حال رہی ہے اور مجھے جس وقت بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ میری مدد کے لیے دستیاب رہے۔ان کا شکر ادا کرتا ہوں۔ شکر گزار ہوں اپنے شعبے کے صدر جناب ڈاکٹر کامران کاظمی صاحب کا اور ان کے ساتھ ڈاکٹر ارشد میراج صاحب اور کوآرڈینیٹر اسحاق صاحب کا جن کی طرف سے حوصلہ افزائی اور شفقت ہر پل میسر رہی ہے۔ احسان مند ہوں جناب خورشید ربانی اور عصمت حسین صاحب کا جن کی مخلصانہ ہمدردیاں اور علمی دوستی کے سبب مجھے قدم قدم پر حوصلہ اور رہنمائی ملتی رہی۔انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود میری ہر وقت مدد کی ہے۔

خصوصاً شکریہ ادا کرتا اپنی امی جان کا جن کی پر خلوص محبت اور دعائیں ہر مشکل وقت میں سہارا ثابت ہوئی ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کا سایہ میرے سر پر سلامت رکھے۔ شکریہ کا سب سے زیادہ مستحق میرے قفیل بڑے بھائی محمد معصوم صاحب ہیں۔ جن کی بدولت میں آج اس مقام تک پہنچا ہوں۔ تمام تعلیمی اخراجات کے ساتھ ساتھ ایک اچھا تعلیمی ماحول بھی دیا ہے۔ ان کے لیے دعا گو ہوں کہ آقائے دو جہاں کے صدقے اس کے لیے ہمیشہ آسانیاں اور خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔ آخر میں اپنے والد محروم کے لیے دعا کرتا ہوں کہ خداوند انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔

محمد امجد

ایم ایس سکالر

باب اول:

عصبیت اور امتیاز کا تعارف

عصبیت:

عصبیت ایک ایسا جذبہ ہے جس کو زمانہ ءقدیم میں انسان اپنے خاندان یا قبیلے کی حفاظت اور مضبوطی کے لیے اہم سمجھتا تھا۔ عصبیت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لغت فرہنگ آصفیہ میں سید احمد دہلوی نے یہ لکھے ہیں:

"استواری، رشتہ داری، خویشاوندی اور رگ وپے کی شراکت"[1]

ریختہ ڈکشنری ایپ میں عصبیت کے معنی ہیں۔

"گروہ بندی کی وجہ سے پیدا ہونے والی مضبوطی قرابت کا لحاظ و خیال، اپنے مسلک یا گروہ کی وفاداری اور پاسداری" اور دوسرے معنی یہ لیے ہیں کہ "اپنوں کی بے جا حمایت اور دوسروں سے نفرت، تعصب، وہ تعلق جو وراثت میں حصے کا مستحق کرے۔"[2]

عصبیت کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ کسی آدمی کی حمایت اور اس کے بچاؤ میں خاندان، قبیلہ یا رنگ و نسل کی طرف داری کے لیئے کھڑا ہو جانا چاہے معاملہ حق کا ہو یا باطل کا عصبیت کہلاتا ہے۔

اس روئے زمین پر اکثر چیزوں کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے استعمال سامنے آتے ہیں۔ کسی بھی چیز کو لوگ پہلے پہل مثبت استعمال کرتے ہیں اور پھر بعد میں آہستہ آہستہ اس چیز کا منفی استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عصبیت کی کہانی بھی کچھ ایسی ہے۔ جب لوگ ابتدا میں قبیلوں کی صورت میں رہتے تھے تو وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قبیلے کی عزت و آبرو کے لیے جذبہ ءعصبیت کا ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں جس قبیلے میں عصبیت زیادہ قوی ہوتی تو وہ قبیلہ حکومت کرتا اور جس قبیلے میں عصبیت کم ہوتی یا نہ ہوتی تو وہ شکست خوردہ ہو کر صف ہستی سے مٹ جاتا تھا۔ کیونکہ اس دور میں قبیلوں کی آپس میں جنگیں ہوتی تھیں۔ پھر جس قبیلے میں اتفاق و اتحاد جتنا مضبوط ہوتا یعنی عصبیت زیادہ ہوتی وہ قبیلہ فتح حاصل کر لیتا تھا۔ یہ عصبیت کا مثبت استعمال ہے اس لیے علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں عصبیت کو معاشرے کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک عصبیت کی وجہ سے معاشرہ ترقی اور عروج حاصل کرتا ہے۔ ابن خلدون عصبیت سے مراد گروہی شعور لیتے ہوئے کہتا ہے کہ اس سے یک جہتی، وحدت، یگانگت اور اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ ابن خلدون نے عصبیت کی تعریف یوں کی ہے:

"عصبیت احساسات کے مشترک ہونے کا نام ہے۔ عصبیت عصبیہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں "پٹھا"۔ جسم میں تمام پٹھے ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں اور ان میں اس طرح اشتراک احساس پایا جاتا ہے کہ اگر جسم کے کسی حصے میں ذرا بھر بھی کوئی

تکلیف ہو یا جسم کا کوئی حصی کسی چیز سے مس کرے تو فوراہی تمام جسم اس کا احساس اور ادراک کرلیتاہے۔"[3]

ابن خلدون عصبیت کے جذبے کی وجہ نسبی اتحاداور دیگر قریبی تعلقات کو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بہت ہی کم ایسے آدمی ہوں گے جن کی طبیعت میں صلہ رحمی کامادہ نہ ہو۔اسی مادہ کااثر ہے کہ انسان جب دیکھتاہے کہ اس کے عزیزواقارب کسی کے ظلم کاشکار ہوگئے ہیں۔یاہلاکی و مصیبت کالقمہ بن گئے ہیں تواس کاخون جوش کھانے لگتاہے۔اور پھراپنے آپ میں نہیں رہتا۔وہ اس کی تاب نہیں لاسکتاکہ اس کاقریبی عزیز مصیبت میں پڑادم توڑرہاہو یادشمن کے پنجہء ظلم میں پھنساہواور وہ اس کو خاموشی سے دیکھے۔بلکہ چاہتاہے کہ عزیز سے پہلے اپنی جان کو ہلاکی کے منہ میں دے دے۔یہ انسان کافطری جذبہ ہے جس پر وہ پیداہوا ہے۔پھراگر رشتہ داری بہت ہی قریب کی ہےاور خونی اتصال بہت گہراہے توخیراندیشی اور قربانی کاجذبہ بھی اسی مقدارسے زبردست ہوگا۔اوراگرقرابت دور کی ہےاور تعلقات تقریباًبھول کے نذر ہوئے،فقط شہرت باقی ہے توایسی صورت میں بھی اقرباء کی مدد کے لئے رگ حمیت حرکت میں آتی ہے گووہ جوش وبرہمی پیدا نہ ہو جوایک زیادہ قریبی عزیز کے متلائے مصیبت ہونے پر ہوتی ہے۔"[4]

اس طرح ابن خلدون اس بات کی بھی واضحات کرتاہے کہ جو خاندان یاگھرانا عصبیت میں قوی تر ہوتاہے وہ ملک یا ریاست پر حکمرانی کرتاہے۔اس کے یہ الفاظ ہیں:

"اگرچہ ہر قبیلہ اور قبیلے کی ہر شاخ میں سب ایک ہونے کے سبب ایک عام عصبیت سب میں کارفرماہوتی ہے۔لیکن خاص خاص نسب کی بناپراور دوسری عصبیتوں کا بھی وجود ہوتا ہے جو عام عصبیت سے قوی تراور مؤثر تر ہوتی ہیں۔مثلاایک کنبہ اورایک گھر والے یا ایک باپ کی اولاد کہ ان میں آپس میں جو ہمدردی و خیر خواہی ہوگی وہ قریب یا دور کے چچازاد بھائیوں میں نہیں ہوسکتی۔توگویاعصبیت دوطرح کی ہوئی،ایک عام ایک خاص۔ خاص کے لحاظ سے وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ایک جان دو قالب ہوتے ہیں اور عام عصبیت کی روسے وہ ساری قوم وقبیلہ سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔اورایسے ہی خیر خواہی وہمدردی ہر دو عصبیتوں کا تقاضاہے مگر نسب خاص سے جو عصبیت پیداہو وہ رشتہ

کے قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی ایک بین بات ہے کہ ریاست و سرداری قبیلہ کی ہر شاخ پر نہیں بٹتی، بلکہ اس کا سہرا کسی ایک ہی شاخ کے سر رہتا ہے۔ اور وہ وہی شاخ جس میں عصبیت بہت زیادہ ہے۔ اور اس بنا پر غلبہ و شوکت بھی زیادہ۔ کیونکہ ریاست غلبہ و شوکت چاہتی ہے۔ بغیر اس کے وہ چل نہیں سکتی۔"[5]

ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عصبیت کا مثبت استعمال خاندان، قبیلے اور ریاست کے لیے انتہائی اہم ہے۔ لیکن جب عصبیت کا مثبت استعمال کی بجائے منفی استعمال ہونا شروع ہو جائے تو معاشرے میں نفرت انگزی، انتشار، انانیت، قومیت اور تفرقہ بازی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس سے معاشرے ٹوٹ پھوٹ کر زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔

عصبیت کو منفی استعمال کی وجہ سے تمام فتنوں کا مرکز تصور کیا جاتا ہے بعض مؤرخین نے اس کو فتنوں کی ماں تک کہا ہے کیونکہ اس سے بے شمار فسادات پیدا ہوتے ہیں اور معاشرے کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں جب تعصب کی ہوا چلتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتی کہ مہذب، غیر مہذب، تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ، دیندار اور غیر دیندار کون کیا ہے بلکہ وہ سبھی کو اپنی زد میں لپیٹ لیتی ہے۔ تعصب نفرت اور بدعنوانی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ تعصب کی وجہ سے انسان تعلقات میں شدت پسند ہو جاتا ہے کیونکہ اس کو دوسرے انسانوں کی ترقی، عزت اور کامیابی سے حسد ہونے لگتی ہے اس لیے تعصب یا عصبیت کو حق و انصاف کا ازلی دشمن قرار دے۔ یہ معاشرے میں بغض و عداوت اور حسد و عناد کا زہر گھول دیتا ہے۔ جس کے باعث انسان جنگ و جدل اور قتل و قتال کرنے سے ذرا بھر بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے۔ اگر تاریخ کے اوراق الٹا کر دیکھے تو اس زمین پر پہلا انسانی قاتل بھی تعصب، بغض اور عداوت کی وجہ سے ہوا تھا۔ حضرت آدمؑ کے بیٹوں ہابیل اور قابیل دونوں نے جب قربانی کی تو اللہ تعالیٰ نے ہابیل کی قربانی اپنی بارگاہ میں قبول فرما لی اور قابیل کی رد کر دی تھی۔ اس وقت قابیل نے حسد کی بنیاد پر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا تھا۔ تب سے اس روئے زمین پر انسان دوسرے انسانوں کا خون بہا رہا ہے اس کی بنیادی وجہ صرف تعصب اور حسد ہی ہے۔ تاریخ انسانی کے کئی باب تعصبات کے نقصانات سے بھرے پڑے ہیں۔ تعصبات کی وجہ حقوق کا ضیاع، ظلم و ستم کا رواج قائم ہوا ہے۔ سر سید احمد خان تعصب کے بارے میں یہ لکھتے ہیں:

"انسان کی خصلتوں میں سے تعصب ایک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بد خصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔ متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے، مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعصب اُس کے برخلاف بات سننے، سمجھنے اور اُس پر غور کرنے کی اجازت

نہیں دیتا اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے، بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا۔

تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے، مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔"[6]

عصبیت کی اقسام

قومی/نسل عصبیت:

قومی یا نسلی عصبیت ایک ہی چیز ہے۔ پہلے زمانے میں قومی عصبیت کو نسلی عصبیت کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کیونکہ اس دور میں انسان نسل کی بنیاد پر پہچانا جاتا تھا اور پھر نسل کی وجہ سے ایک دوسرے کو برتر یا کمتر سمجھتے تھے۔ یہی نسل یا قوم پرستی کی ابتداء تھی جس نے یورپ میں ترقی پائی ہے۔ ایک طویل عرصے تک قوم پرستی کی نشوو نما ہوئی لیکن مسیحیت کی طاقت نے اسے اپنے کنٹرول میں رکھا۔ کیونکہ ایک نبی کی تعلیم کتنی ہی بگڑی ہوی صورت میں موجود ہو وہ نسلی اور قوم پرستی کی بجائے ایک وسیع انسانی نقطہء نظر رکھتی ہے۔ رومن ایمپائر نے بھی قوم پرستی کی روک تھام کے لیے ایک اہم کردار ادا کیا اور چھوٹی چھوٹی قوموں کو مشترکہ اقدار دے کر قومی اور نسلی عصبیت کی شدت کو کم کیا۔

"خاص عہد تک جب جنگل میں رہنے والے انسان کو اپنی بقا کی جنگ لڑنا تھی تو اس کو اکٹھے رہنے میں عافیت محسوس ہوتی تھی لیکن بعد میں جب سماج نے شہری حیات کا راز پالیا تو اس نسلی عصبیت کی جڑیں کم زور پڑ گئیں۔ اس کی مثال ہم مختلف ممالک میں دیکھ سکتے ہیں جہاں نسلی عصبیت کے مثبت اور منفی دونوں رنگ نمایاں ہیں۔ امریکا میں مختلف یورپی ملکوں کے مہاجرین آباد تھے۔ ان مہاجرین کی اگلی چند نسلیں ایک جگہ پر پہنچ کر ایک قوم بن گئیں۔ برطانیہ، جنوبی افریقا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے باشندے ایک ہی نسل کے لوگ ہیں لیکن انھوں نے اپنی الگ شناخت بنالی ہے اور اب ان کی قوم اور قومیت جدا جدا ہے۔ یعنی دورِ جدید تک آتے آتے نئی قومیتی فلسفے میں کوئی قومیت محض نسلی بنیاد پر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ پائی یا یوں کہیں کہ اس صورتِ حال میں قومیت خالص نسلی حیثیت نہیں

رکھتی۔امریکا، کینیڈا، ایران، ترکی، پاکستان اور بھارت ایسے ممالک ہیں جن میں ایک ہی
وقت میں بہت سی نسلیں رہ رہی ہیں"[7]

اس لیے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے انسانی مساوات کا واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ "گورے کو کالے اور کالے کو گورے پر کسی قسم کی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ تمام انسان مساوی ہیں اور اگر کسی فرد کو کسی دوسرے پر ترجیح دی جاسکتی ہے تو اس کا واحد معیار تقویٰ ہے"۔ آپ ﷺ کے بعد حضرت عمر فاروق نے بھی فرمایا کہ خدا نے ہر انسان کو آزاد پیدا کیا ہے لیکن دنیا نے اس کو مختلف غلامی کی جکڑ بندیوں میں باندھ دیا ہے۔

ولیم رابرٹسن جو اسکاٹ لینڈ کے ایک مفکر تھے۔ انہوں نے 1772ء میں انسانیاتی اصطلاحوں میں نسلی مساوات کا تذکرہ کیا تھا۔ اور اس نے کہا کہ ہر انسان چاہے وہ کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو پیدائشی طور پر سب یکساں صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ بات اس زمانے میں کہی گئی جب امریکہ میں جنگ آزادی اختتام پذیر ہونے والی تھی۔ اور یہ وہ وقت تھا جب روسو فرانس میں انسانیات کے فلسفے پر غور و فکر میں محو تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ مختلف مذہبی پیش واؤں اور فلسفیوں نے اس موضوع پر بے شمار کتب لکھی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ نسلی تعصبات انسانی برتاؤ کے خمیر کا جزو بن گیا ہے۔ جس کو نسلیت یا نسل پرستی کہتے ہیں۔ عبدالقادر عمادی نے اپنی کتاب نسل اور نسلی امتیازات میں اڈامسن ہوبل کا قول نقل کیا ہے۔

"نسلیت کا نظریہ اس مفروضے پر قائم ہے کہ ایک گروہ دوسرے کے مقابلے میں برتریت
کے مغالطہ پر القان رکھتا ہے"[8]

نسلیت اور نسلی پرستی کے مسئلہ کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا تو اس چیز کی وضاحت ہو چکی ہے کہ نسل پرستی اور نسلیت کا محرک نسلی تعصب ہے۔

نسل یا قوم پرست کے جذبات اپنی نسل / قوم کے ساتھ ہونے والے مظالم یا زیادتیوں سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ اپنی نسل / قوم کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو برداشت نہیں کرتا اور وہ ان بے انصافیوں کی تلافی کرتا ہے جو کسی اور نسل / قوم نے ان کے ساتھ کی ہوتی ہیں۔ اس جذبے کو کوئی شریعت، کوئی روحانی تعلیم، کوئی اخلاقی ہدایت نہیں دے رہا ہوتا بلکہ یہ جذبہ قوم پرستی، نسلی منافرت کا باعث بنتا ہے۔ پھر یہی جذبہ بدامنی، قتل و غارت اور جنگ کا باعث بنتا ہے۔

اسلام اس لیے نسل پرستی اور قوم پرستی کو مسترد کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام امن و محبت کا دین ہے اور قوم پرست لوگ اس کے اصولوں کے خلاف کام کرتے ہیں۔۔ اسلام میں انسان کو برتری صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد و عورت سے پیدا فرمایا اور ہم نے تمہیں (بڑی بڑی) قوموں اور قبیلوں میں (تقسیم) کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہو، بے شک اللہ خوب جاننے والا خوب خبر رکھنے والا ہے۔"[9]

ایک اور جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"خبردار آپس میں لڑائی جھگڑے سے دور رہنا ورنہ کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری بنی ہوئی یہ ہوا اکھڑ جائے گی تمہارا شیرازہ بکھر جائے گا۔"[10]

حضرت محمد ﷺ نے دو مرتبہ اپنے صحابہ اکرام کے درمیان عقد اخوت قائم کیا یعنی ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی بنایا۔ قرآن کی یہ آیت بھی اس موقع پر نازل ہوئی۔

"انما المؤمنون اخوة"[11]

ترجمہ: سارے صاحبان ایمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں

دنیا میں مذہب کے بعد زیادہ تر جنگیں نسلی/قومی تعصب کی بنیاد پر لڑی گی ہیں۔ سب سے بڑی جنگیں جنگ اول اور دوم کا باعث نسلی/قومی تعصب تھا۔ جس میں لاکھوں انسان لقمہ اجل بنے تھے۔ اس زمین کے ہر خطے پر آباد انسانوں نے نسلی/قومی تعصب کی بنیاد پہ آپس میں جنگیں کر کے اپنی برتری قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اکثر جنگوں میں مختلف قوموں اور قومیتوں نے اپنے ہم مذہب لوگوں کا قتل عام کیا ہے۔ اس کی مثال جرمن قوم ہے۔ جس نے ہٹلر کی قیادت میں ان ممالک پر حملہ آور ہوئے جو کہ ہم مذہب تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہٹلر اور جرمن قوم خود کو معتبر اور غیرت مند سمجھتے تھے۔ اسی طرح سر لنکا اور بھارت ماضی قریب میں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے تھے حالانکہ ان دونوں ممالک کی اکثر آبادی ہم مذہب ہے لیکن دوسرے معاشروں کی طرح یہ بھی نسلی/قومی تعصب کی زد میں آ گئے۔ یہی حالت افغانستان کی ہے جہاں پر ازبک، تاجک اور ہزارہ پشتونوں کے مخالف رہے ہیں۔ 1980ء کے کمیونسٹ انقلاب سے لیکر مجاہدین اور طالبان کے دور تک اس ملک میں نسلی تعصب بنیادی درجہ رکھتا ہے۔

دنیا کے ہر ملک میں قومیتوں کے مسائل ہر زمانے میں رہے ہیں۔ یورپ جیسا ملک اس مسئلے کا نہ صرف شکار رہا بلکہ رواں صدی کے دوران اس مسئلے کی شدت میں اضافہ ہوا ہے اور دوسرے ممالک برطانیہ کے درمیان معاشی مسائل کے علاوہ نسل پرستی کی وجہ سے تعلقات بہت شیدہ رہے ہیں۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نسل پرستی اور قوم پرستی نہ صرف ماضی کی جنگوں کی وجہ رہی بلکہ اب بھی یہ پوری شدت کے ساتھ دنیا بھر میں پائی جاتی ہے۔

مذہبی عصبیت:

مذہبی تعصب، تعصب کی سب سے زیادہ خطرناک قسم ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ فسادات اسی (مذہبی تعصب) کی بنیاد پہ ہو رہے ہیں۔ تعصب کی وجہ سے انسان کے اندر صبر اور برداشت کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ہر چیز کو مذہب یا فرقے کی عنیک لگا کر دیکھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشروں میں تصادم پیدا ہو جاتا ہے۔ مذہب اور انسان کا جولی دم کا ساتھ ہے۔ دنیا میں بے شمار مذاہب موجود ہیں جن کے ماننے والوں میں اکثر ایک دوسرے کے ساتھ تعصب پایا جاتا ہے۔ تاریخ میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

یہودیت اور عیسائیت کے پیروکاروں نے ہمیشہ ایک دوسرے کو تعصب کا نشانہ بنایا ہے۔ ایک عرصے تک مسیحی لوگ رومن امپائر میں معتوب رہے مگر 333ء میں قسطنطین اعظم (بازیطنی سلطنت کا بانی تھا۔ جو پہلا "قیصر" تھا) تخت نشین ہوا تو اس نے کچھ دن بعد عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اس طرح مسیحیت رومن امپائر کا سرکاری مذہب بن گیا لیکن سیاسی اقتدار ملتے ہی یہ مظلوم اور ستم رسیدہ مسیحیت اپنے آزار رسانوں سے کہیں زیادہ ظالم اور ستم شعار ثابت ہوئی۔ رومن امپائر کی اگلی دو سو سالوں کی تاریخ مذہبی تشدد، تنگ نظری اور فرقہ وارنہ کشمکش کی مسلسل داستان ہے۔

عرب کے شہر مکہ میں 600ء میں جب دین اسلام کا ظہور ہو تو اس کے ماننے والے پر کفار نے اس قدر ظلم و ستم کئے کہ ان کو مختلف شہروں کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ اس بعد بھی کفار کے ظلم و ستم نہ رکے، اور مسلمانوں کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں۔ یہ سب واقعات مسلم اور کفار کے درمیان مذہبی تعصب کی بنیاد پر ہوئے تھے۔

گیارہویں صدی میں شروع ہونے والی صلیبی جنگیں مذہبی مقاصد کے حصول کے لئے لڑی گئیں۔ یہ جنگیں جو تقریبا دو سو سال تک جاری رہی ہیں۔ یہ فلسطین بالخصوص بیت المقدس کا قبضہ مسلمانوں سے لینے کے لیے یورپ کے مسیحیوں نے شروع کی تھیں۔ بیت المقدس کو عمر ابن اخطاب نے فتح کیا تھا۔ جو کئی سو سال تک مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ گیارھویں صدی میں سلجوقیوں کے زوال کے بعد مسیحیوں کے دلوں میں بیت المقدس کی فتح کا خیال پیدا ہو

ا۔ان نو جنگوں میں لاکھوں انسانوں کا قتل عام ہوااور ان جنگوں میں تعصب، تنگ نظری، بداخلاقی اور بدعہدی کا جو مظاہرہ اہل یورپ نے کیاوہ ان کی پیشانی پر شرمناک داغ ہے۔

اگر ہم برصغیر پاک وہند کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھے تو کئی صفحات مذہبی تصادم سے سیاہ شدہ ملتے ہیں۔ پاک وہند میں مختلف مذاہب کے ماننے والے آباد ہیں۔ جن میں سکھ مت، بدمت، ہندومت، جین مت، عیسائیت اور اسلام وغیرہ وغیرہ۔ان سب کے آپس میں مذہبی بنیادوں پر اختلافات پائے جاتے ہیں۔ جیسے ہندوں اور سکھوں کے درمیان مذہبی مقاصد کی وجہ سے جنگیں ہوئیں تھیں۔اس طرح 1857ء کی آزادی کی ناکامی کا سارا ملبہ ہندواور عیسائیوں نے مسلمانوں پر ڈال کر ان کو ظلم وستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے برصغیر کی زمین مذہبی فسادات سے سرخ ہونا شروع ہوگئی اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ حالانکہ 1947ء پاک وہند کو تقسیم کر کے پاکستان اور ہندوستان دو الگ ملک بنادیے گئے لیکن ان دونوں ممالک میں اب بھی ہندو، مسلم اور عیسائی ایک دوسرے کو مذہبی تعصب کی وجہ سے ظلم وستم کا نشانہ بنارہے ہیں۔

> "تمام مغربی اقوام نے مذہب کو ریاست اور قومیت میں ثانوی حیثیت دی ہے۔امریکا میں مختلف مذاہب اور رنگ ونسل کے لوگ ایک قومیت میں پرودے گئے ہیں۔اس کے باوجود اسرائیل اور پاکستان میں ثقافتی، لسانی اور تمدنی اختلافات کے باوجود لوگ ایک قومیت میں مذہب کی بنیاد پر جمع ہوئے ہیں۔لبنان میں عیسائی اور مسلمان سیاسی سطح پر ایک قومیت میں جڑے ہوئے ہیں لیکن قبرص میں عیسائیوں اور مسلمانوں نے مذہب کی بنیاد پر اپنے آپ کو الگ کر لیا۔یہی کچھ برصغیر میں ہوا کہ ہندواور مسلم شدت پسندوں نے مذہب کی بنیاد پر خود کو الگ الگ کر لیا۔"[12]

پاکستان میں موجودہ صورتحال کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پاکستانی معاشرے میں مذہبی تعصب اور فرقہ واریت دن بدن شدت میں اضافہ ہورہاہے۔اس سے معاشرہ کمزور ہورہاہے اور پہلے سے موجود سماجی ونفساتی خلیج مزید گہری ہوتی جارہی ہے۔ قومی اور مذہبی فرائض سے توجہ ہٹنے کے لیے معاشرے میں یہ اختلافات پیدا کیے جارہے ہیں۔ قوم کا فکری سرمایہ ان مہمل اور فضول باتوں کی نذر ہورہاہے۔اس مذہبی شدت پسندی کی وجہ سے معاشرے میں نقصان کے علاوہ مختلف فقہی گروہوں کے درمیان ذہنی دوری پیدا ہورہی ہے۔ان کی ایک دوسرے سے نفرت اور معاشرتی سطح میں تقسیم ایک تکلیف دہ حقیقت ہے۔

لسانی تعصب:

نسلی اور مذہبی تعصب کے علاوہ لسانی تعصب بھی معاشرے کے زوال کا سبب بناتا ہے۔ معاشرے کے اندر مختلف نسل اور مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کی زبانیں بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں اور انہیں نسل اور مذہب کی طرح اپنی زبان سے بھی محبت ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ انسان نسل اور مذہب سے زیادہ اپنی مادری زبان کو اہمیت دیتا ہے۔ وہ اپنی مادری زبان کی بنیاد پر دوسری زبانوں کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لسانی تعصب کی ابتداء تب سے ہو گی تھی جب دنیا میں انسان لسانی بنیادوں پر تقسیم ہونا شروع ہوئے تھے۔ اس تعصب (لسانی تعصب) کے باعث کئی سلطنتیں اور ریاستیں زوال کا شکار ہو کر ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔ جیسا کہ سلطنت عثمانیہ میں اکثریت ترکی، عربی اور انگریزی زبان بولنے والوں کی تھی۔ باہمی اتحاد کی وجہ سے خلافت کا سورج جگمگاتا رہا اور تقریباً چھ سو سال تک خلافت مکمل آب و تاب کے ساتھ چلتی رہی۔ مگر جب ترکوں نے عربوں اور انگریزوں کے ساتھ ناروا سلوک شروع کیا اور ان کو اعلیٰ عہدے نہ دے تو فسادات شروع ہو گئے۔ پھر یوں ہی خلافت عثمانیہ 37 ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔

اس طرح متحدہ برصغیر کی تقسیم کا سبب بھی لسانی تعصب ہی بنا تھا۔ ایک طویل عرصے سے مسلمان اور ہندو مذہبی اختلافات کے باوجود زندگی گزر رہے تھے لیکن 1867ء کو اردو ہندی تنازع دو قومی نظرے کی بنیاد بنا اور برصغیر کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ معاملہ یہاں تک ختم نہیں ہوا بلکہ 1971ء میں اس نے ایک رخ بدلا اور ایک بار پھر مسلم ملک پاکستان کو اپنی زد میں لیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں اختلافات کی وجہ دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ زبان کا اہم مسئلہ تھا۔ اس مسئلے کو ختم کرنے کے لیے اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔ مگر یہ اختلافات کم نہ ہو سکے اور اکستان دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) اور ایک مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) ہے۔

> "جہاں کہیں زبان علیحدہ ہوتی ہے وہاں ایک علیحدہ قوم وجود میں آجاتی ہے۔"[13]

اسٹالن کے بقول:

> "سیاسی گروہ اور قومی گروہ میں بنیادی فرق لسانی اشتراک کا ہی ہے۔ قومی افراد میں کسی ایک مشترکہ زبان کا رائج رہنا ضروری ہے جب کہ سیاسی گروہ کے لیے لسانی اشتراک و اتحاد شرط نہیں ہے۔"[14]

سیاسی عصبیت:

عصبیت نے مختلف صورتوں میں دنیا بھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔اس بیماری میں دنیا میں آباد کم و بیش ساری قومیں مبتلا ہیں۔ یہ اور بات کہ کہیں اس کی شدت کم ہے تو کہیں زیادہ ہے اور اس کی وجہ سے معاشرے تقسیم در تقسیم ہو کر زوال کا شکار ہو رہے ہیں۔ نسلی، قومی، مذہبی اور لسانی عصبیت کی طرح سیاسی عصبیت بھی پائی جاتی ہے۔ سیاست میں ایک گروہ یا جماعت اپنے سیاسی مقاصد کی وجہ سے دوسرے سیاسی گروہ یا جماعت سے تعصب رکھتی ہے اس کو سیاسی عصبیت کہتے ہیں۔

> "مشترکہ سیاسی مقصد کے لیے اگر کچھ لوگ متحد ہو جائیں تو ان کے درمیان بھی ایک عصبیت جنم لے لیتی ہے۔ برصغیر میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں بہ یک وقت اسی عصبیت پر اپنی سیاسی جدوجہد کرتی رہیں۔ کانگریس تمام ہندوستانیوں کو مشترکہ سیاسی مقصد کے تحت اکٹھا کرنا چاہ رہی تھی جب کہ مسلم لیگ مختلف صوبوں میں مختلف زبانوں اور تہذیبوں کے حامل مسلمانوں کو ایک مخصوص سیاسی مقصد کے لیے متحد کر رہی تھی، اور جب تمام مسلمان اکٹھے ہو گئے تو انھوں نے ایک الگ ریاست بہ نام پاکستان حاصل کر لی۔"[15]

یہاں پر یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جب مذہبی عصبیت رکھنے والوں میں سیاسی عصبیت نے جنم لیا تو پاکستان وجود میں آیا۔ یعنی کہ مذہب کی وجہ سے ان دو سیاسی گروہوں میں سیاسی عصبیت زیادہ شدت کی پائی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے برصغیر دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اس طرح جب پاکستان بنا تو اس کے کچھ عرصہ بعد پاکستان میں موجود دو بڑی سیاسی جماعتوں میں سیاسی عصبیت نے سر اٹھانا شروع کیا۔ 1970 کے الیکشن ہوئے تو مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمن کی پارٹی عوامی لیگ نے ساری نشستیں حاصل کر لی اور مغربی پاکستان میں ان کو ایک نشت بھی نہیں ملی۔ شیخ مجیب الرحمن صرف مشرقی پاکستان کے لیڈر قرار پائے۔ مغربی پاکستان میں ذولفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے میدان مار لیا اور پیپلز پارٹی کا مشرقی پاکستان میں کوئی امیدوار نہیں تھا۔ ان الیکشن کو بنیاد بنا کر مشرقی پاکستان کی عوام جس میں پہلے سے لسانی تعصب موجود تھا اب ان میں سیاسی تعصب پیدا کر کے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے نام ایک الگ ریاست بن گی۔ یہ سب کچھ سیاسی عصبیت کی وجہ سے ہوا تھا۔

سیاسی عصبیت کی ایک مثال وطنِ عزیز کی موجودہ سیاسی صورت حال میں دکھی جاسکتی ہے۔ عمران خان کی تحریک انصاف اور اس کی مخالف سیاسی جماعتوں میں سیاسی تعصب بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ عمران خان کے حامی

نواز شریف اور اس کے چاہنے والوں سے اس حد تک نفرت کرتے ہیں کہ ان نام بھی سنانا گوارا نہیں کرتے ہیں۔اس طرح عمران خان کے مخالف اس سے اس قدر حسد کرتے ہیں کہ اگر کوئی ان کے سامنے اس کا نام لے تو وہ اس سے تعلق تک ختم کر دیتے ہیں۔ان سب کی وجہ سیاسی عصبیت ہی ہے۔

ثقافتی عصبیت:

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں دانائی، عقلمندی اور مہارت وغیرہ۔ ثقافت کے لیے انگریزی میں لفظ کلچر رائج ہے۔فرہنگ کاروں میں ثقافت کے معانی یہ ہیں۔"ثقافت کے معنی لطیفہ، علم وادب تمدن اور کسی قوم کے تصورِ حیات ہیں"۔

ثقافت گروہِ انسانی یا کسی قوم کے مخصوص عقائد، نظریات، افکار واخلاقیات، تہذیبی روایات، اندازِ معاشرت کی فکری اور تخلیقی سرگرمیوں کا جو اس کو دوسری اقوام سے مختلف اور ممتاز کرتے ہیں۔ کسی ایک قوم کی ثقافت دوسری قوم میں جب ضم ہو جاتی ہے تو وہ اس قوم کی موت کا اعلان سمجھا جاتا ہے۔یعنی اس قوم کو پھر خواہ دوسرے اپنی نگاہوں سے دیکھ سکیں مگر وہ کسی قسم کی نہ حرکت کر سکتی ہے اور نہ ہی اپنا احساس ہوتا ہے۔ تہذیب و ثقافت اور انسان ایک دوسرے بہت گہرا تعلق ہے۔

> "ثقافت میں زندگی کا جتنا کاروبار ہے وہ سب شامل ہے۔لباس ہے، زبان ہے، خوراک ہے، رہائش کے طریقے ہیں، رسم ورواج ہیں، آپس میں ملنے جلنے کے طریقے ہیں، زندگی کا جتنا روزمرہ ہے جس کو انگریزی میں "وے آف لالف" کہتے ہیں وہ سب زندگی کا تمام روزمرہ کسی معاشرے کے کلچر کی ناتراشیدہ صورت ہے۔ جب کوئی آدمی خاص قسم کا لباس پہنتا ہے یا خاص قسم کا کھانا کھاتا ہے اس وقت وہ یہ نہیں سوچتا کہ میں کلچر کا کام کر رہا ہوں وہ تو غیر شعوری بات ہے۔وہ تو روزمرہ کے طریقے سے عمل کرتا ہے۔"[16]

ثقافتی حوالے سے بھی سماج میں عصبیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ایک خطے میں مختلف ثقافتی گروہ آباد ہوں اور ان کے درمیان پیدا ہونے والے ثقافتی تصادم کی وجہ عصبیت ہی ہوتی ہے اور وہ ثقافتی عصبیت کہلاتی ہے۔یعنی جب ایک گروہ کے افراد اپنی ثقافت کو بہتر یا اعلیٰ سمجھتے ہوں اور دوسروں کی ثقافت کو حقیر یا کم تر سمجھتے ہوئے ان سے نفرت اور ظلم کا سلوک کرنے لگ جاتے ہیں تو وہ ثقافتی عصبیت کی بنیاد پر یہ سب کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی جنگیں ہوئی ہیں چاہیے وہ نسلی،، مذہبی، لسانی یا پھر سیاسی جنگیں ہی ہوں اگر آپ ان کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں اکثر کی شروعات ثقافتی عصبیت سے ہی ہوئی ہے۔ مختلف ثقافتوں کے درمیان عصبیت زمانہء قدیم سے

پائی جاتی ہے ثقافتی عصبیت اتنی قدیم ہے جتنا انسان خود ہے۔ مثال کے طور آپ مغرب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو وہاں پر لڑی جانے والی جنگوں میں زیادہ تر ثقافتی اختلافات کی وجہ سے ہوئی ہیں۔

"مغرب میں ثقافتی قوم پرستی اسرائیل کی حمایت اور اسلام کی مخالفت اسی بنیاد پر کرتی ہے
کہ ان کے نزدیک اسلامی ثقافت مغربی اقدار سے مطابقت نہیں رکھتی۔"[17]

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم میں بھی بنیادی وجہ ثقافتی عصبیت تھی۔ کیونکہ ہندوستان میں دو بڑی ثقافتیں موجود تھیں۔ ایک ہندو ثقافت اور دوسری مسلم ثقافت تھی۔ ہندو ثقافت سے مسلمانوں کو نفرت تھی اور مسلم ثقافت کو ہندو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان دونوں کی ثقافت میں کچھ ایسے رسوم و رواج تھے جن کی وجہ ان دونوں گروہوں کے درمیان لڑائی جگڑے ہوتے تھے اور جب ثقافتی تضادم نے شدت اختیار کی تو مذہبی اور سیاسی مفاد پرستوں نے اس کو دو ٹکروں میں تقسیم کر دیا۔ مگر اس تقسیم کی اصل بنیاد ثقافتی عصبیت ہی بنی ہے۔ یعنی جب دو ثقافتوں کا ایک خطے میں رہنا مشکل ہوا تو انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔

اس طرح ہم سب پاکستانی دو قومی نظریے کا موزانہ مذہب سے کرتے ہوئے بظاہر اسلامی ثقافت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر عملی زندگی میں مختلف ثقافتوں بٹے ہوئے ہیں۔ اصل میں ہم اسٹیریوں ٹائپ ثقافت کو ایک دوسرے پر زبردستی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ مثلا ہمارے پاکستانی معاشرے میں غیر پختونوں کے کچھ گھرانے ایسے بھی موجود ہیں جہاں بیٹھک کا اختتام کوڑھ مغزی اور بے وقوفی پر مشتمل "پٹھانوں" سے متعلق لطیفوں پر ہوتا ہے۔

اگر آپ مشرقی اور مغربی پاکستان کی تقسیم کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس تقسیم کی بنیادی ثقافتی عصبیت ہی تھی۔ بظاہر تو دونوں مسلم ثقافت کا نعرہ لگانے والے تھے مگر مشرقی پاکستانی میں بنگلی ثقافت کا زیادہ اثر تھا وہ اس لیے اپنی زبان کو سرکاری سطح پر لے آنا چاتے تھے۔ زبان بھی ثقافت کا ایک اہم جز سمجھا جاتا ہے اس لیے بنگلیوں نے ثقافت الگ ہونے کی وجہ ایک الگ ریاست کا مطالبہ کر دیا اور پھر ثقافتی عصبیت کی وجہ پاکستان کی تقسیم ہوئی۔ مشرقی پاکستان بنگلادیش کا نام دیا گیا اور مغربی پاکستان جو موجودہ پاکستان ہے۔

یہی صورت حال ہمارے پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کی بھی ہے وہاں پر مختلف ثقافتوں کے درمیان تصادم پایا جاتا ہے۔ کراچی میں مہاجر اور سندھی ایک دوسرے کو ثقافتی حوالے سے برداشت تک نہیں کرتے ہیں۔ اور اس طرح پاکستان کے سب سے بڑے صوبہ بلوچستان کی بھی یہی حالت ہے۔ وہاں پر مقامی ثقافت کے تناظر میں غیر بلوچوں ناقابل برداشت ہیں۔

معاشی عصبیت:

جیسا انسانوں میں نسلی، قومی، مذہبی، لسانی اور علاقائی گروہ ہوتے ہیں اس طرح معاشرے میں معاشی گروہ بندی بھی موجود ہے۔ جو اپنے معاشی مفادات کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ گہری عصبیت رکھتے ہیں تاکہ ان کے مفادات کو کوئی دوسرا نقصان نہ دے سکے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غلام اصغر خان اپنی کتاب "نظریہء قومیت: عالمی و مقامی تناظر" میں کچھ یوں لکھتے ہیں۔

> "اشتراکِ معاش وہ بنیادی محرک ہے جو حریفوں کو بھی ایک لڑی میں پروئے رکھتا ہے/رکھ سکتا ہے۔ لوگوں کے مختلف گروہوں میں یہ احساس کہ باہم مل کر رہنے سے ان کے سیاسی اور معاشی مفادات کا بہتر طور پر تحفظ ہو سکتا ہے، ایسی صورت میں وہ ایک قوم بن جاتے ہیں۔ ایک ہی ادارے، مارکیٹ یا چھوٹے بڑے سیاسی یا معاشی سرگرمیوں کے مقامات پر جو الیکشن ہوتے رہتے ہیں، ہم وہاں سیاسی سطح پر ایک دوسرے کے سخت مخالفین بھی ایک ہی قومی دھارے میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ وہی اشتراکِ معاش و مفاد ہے۔"[18]

یہ معاشی عصبیت کا مثبت پہلو ہے اس کا منفی پہلو جو کئی ترقی پذیر ممالک میں ایک سنگین مسئلہ بن گیا ہے۔ کیونکہ وہاں معاشی پالیسیاں بھی اسی عصبیت کی ب وجہ علاقائی سطح پر تیار ہوتی ہیں۔ یہی پالیسیاں پھر تضادات اور تفریقات پیدا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر شہری اور دیہی علاقوں کے لوگوں کے درمیاں تفریق اور تعصب معاشی بنیاد پر پایا جاتا ہے۔ دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد زراعت کے شعبے سے منسلک ہوتے ہیں، ان کی بڑی تعداد بہتر روزگار کی تلاش میں شہری علاقوں کا رخ کرتی ہے جن سے دیگر مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

سماجی رجحانات اور بہتر تعلیمی سہولیات کے باعث شہری آبادی کا اکثر حصہ دیہی آبادی کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ ہوتا ہے اور صنعت کے شعبے میں بھی ایسے افراد کو ترجیح دی جاتی ہے جو جدید تعلیم اور تکنیکی صلاحیتوں کے حامل ہوں۔ دوسری طرف دیہی علاقوں سے ملازمت کے حصول کے لیے آئے افراد بے روزگاری اور غربت کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔ جبکہ دیہی علاقے جو پہلے سے پسماندگی کا شکار ہوتے ہیں وہ مسلسل نظر انداز ہونے کی وجہ سے مزید استحصال اور حکومتی لاپرواہی کی مثال بن جاتے ہیں۔

یہ صورتحال نہ صرف ملکی ترقی میں اہم رکاوٹ کا باعث ہے بلکہ شہری اور دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان متعصبانہ رویے کے اسباب میں بھی شامل ہے۔

امتیازات:

امتیازات، امتیاز کی جمع ہے۔اس کے معنی 'فرق' کرنے کے ہیں۔ یہ بھی عصبیت کی ایک شکل ہے۔ ہم اپنے ارد گرد نظر دوڑا کر دیکھتے ہیں تو ہمیں دولت، طاقت اور حثیت میں فرق نظر آتا ہے۔ کچھ طبقات ایسے ہیں جن کو دوسروں کے مقابلے میں اعلیٰ مقام اور زیادہ مراعات حاصل ہیں۔اس قسم کے عدم مساوات کو ہم سماجی عدم استحکام کا نام دیتے ہیں۔اس وجہ سے اکثر سماجی گروہوں کے خلاف غیر منصفانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ جس کو ہم امتیازی سلوک کہتے ہیں۔

امتیازی سلوک بہت سی خصوصیات پر مبنی ہو سکتا ہے۔اس کا اکثر اقلیتیں اور کمزور طبقات نشانہ بنتے ہیں ۔لیکن بعض اوقات اکثریت بھی اس کی زد میں آجاتی ہیں۔ جیسا کہ ایک طویل عرصے تک سیاہ فام لوگ نسل امتیاز کا نشانہ بنتے رہے۔امتیازی سلوک گروپس یا افراد کو کسی نہ کسی طرح سے نقصان پہنچاتا ہے۔ نسل پرستی، جنس پرستی ،مذہب پرستی، ہوموفوبیا، ٹرانس فوبیا، سیکسزم (ٹرانس جینڈر افراد کے) کلاسزم، معذوری اور سیاست وغیرہ امتیاز کی وجہ بنتے ہیں۔ امتیازی سلوک اکثر عصبیت کا نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ پہلے سے ایک تشکیل شدہ منفی رویہ بعض افراد یا گروپس کو کمتر سمجھنے کی طرف لے جاتا ہے۔

"امتیاز بطور لفظ، مثبت اور منفی مفہوم کے ساتھ مستعمل ہے۔ایک طرف، یہ (امتیاز) "تمیز کرنے کا عمل نیکی اور بدی یا اچھے اور برے میں فرق کرنے کے لیے مثبت معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ کسی کے خلاف جنس، نسل، رنگ، مذہب، زبان اور علاقے کی بنیاد پر متعصبانہ نقطہ نظر کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔اس بات سے معلوم ہوا کہ امتیازی سلوک کوئی نئی چیز نہیں ہے قصہ ہابیل و قابیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رویہ انسانی جبلت میں ابتدا سے ہی موجود تھا۔ 17 ویں صدی کے اوائل میں انگریزی ادب میں امتیازی سلوک کو موضوع بنایا گیا پھر 18 اور 19 ویں صدی میں اس موضوع کو مزید پزیرائی ملی۔امتیازی سلوک منفی معنوں میں قافی عرصے سے استعمال ہو رہا ہے۔

امتیازی سلوک معاشرے میں عدم مساوات کو برقرار رکھتا ہے اور ایک انسان کو اپنے حق سے صرف اس لیے محروم کرتا ہے کہ اس کا تعلق کسی خاص نسل، جنس، مذہب، قوم اور زبان وغیرہ سے ہے۔ جبکہ دوسرے انسان کو اپنے حق سے زیادہ نوازا جاتا ہے۔جب ہم سب انسان اس چیز کا حق رکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ نسل، جنس، مذہب، قوم ،ذات، طبقے، زبان، عمر، صنفی شناخت اور دیگر حیثیت سے قطع نظر، یکسان سلوک کیا جائے۔اس کے باوجود بھی ہر معاشرے میں یہ رویہ یا عمل پایا جاتا ہے۔ جو محض مراعات یا اقتدار کے عہدوں پر ہونے والے افراد "مختلف" گروپ

سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ امتیازی سلوک شروع ہی اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص اپنے انسانی حقوق یا قانونی حقوق سے مساویانہ بنیادوں پر دوسروں کے ساتھ سلوک یا قانون میں کی جانے والی بلاجواز تفریق کی وجہ سے ناخوش ہو۔ دنیا بھر کی کمیونٹیز کے ساتھ کام کرتے ہوئے، ہم امتیازی قوانین اور طریقوں کو چیلنج کرتے ہیں تاکہ یہ یقینی بنایا جاسکے کہ تمام لوگ مساوی بنیادوں پر اپنے حقوق سے خوش رہ سکیں۔

امتیازی سلوک انسانی صحت پر بہت زیادہ اثرانداز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان ڈپریشن، ہائی بلڈ پریشر اور کئی نفسیاتی بیماریاں کا شکار ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں 2015ء کے ایک سروے کے مطابق؛ جو لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے امتیازی سلوک کا سامنا کیا ہے، ان کے تناؤ کی سطح اوسطاً ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہے جو کہتے ہیں کہ انھوں نے امتیازی سلوک سامنا نہیں کیا۔

> "امتیازی سلوک مختلف قسم کے جسمانی اور ذہنی صحت کے مسائل کا باعث بن سکتا ہے۔ درحقیقت، امتیازی سلوک ڈپریشن، موٹاپا، ہائی بلڈ پریشر سمیت کئی مسائل کا سبب بنتا ہے۔"[19]

جو امتیازی سلوک کا سامنا کرتے ہیں ان کو جسمانی اور ذہنی بیماریاں اپنا نشانہ بنالیتی ہیں۔ جب کسی کے ساتھ غیر متصفانہ سلوک کیا جاتا ہے تو وہ اس کو برداشت نہیں کر پاتا۔ جس کی وجہ سے ان پر زندگی کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اور وہ خودکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

امتیازات کی اقسام

ا۔ نسلی امتیاز:

انسان کب نسلوں میں تقسیم ہوا ہے اس بارے میں کوئی یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا ہے۔ جب یہ نسلوں میں بٹ گئے تو پھر یہ ایک دوسرے میں تفریق کرنے لگے۔ نسلی امتیاز اس وقت شروع ہوتا ہے جب کسی شخص کے نسل، ملک/علاقہ، اور رنگ کی وجہ سے اس کے ساتھ نامناسب سلوک کیا جاتا ہے یا اس کے ساتھ وہی سلوک نہیں کیا جاتا جو دوسری نسل یا رنگت والوں کے ساتھ کیا جارہا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مخصوص نسل یا رنگ کے فرد سے شادی کرتا ہے یا ان سے تعلق بناتا ہے تو اپنی ہی نسل کے لوگوں کے ہاتھوں تنقید کا نشانہ بنتا ہے۔ نسلی امتیازی سلوک زیادہ تر ملازمت، سکول، یونیورسٹی اور پبلک پلیس وغیرہ پر کیا جاتا ہے۔ مثال؛ جب آپ ملازمت کے لیے درخوست دیتے ہیں تو آپ کی قابلیت کی بجائے نسل یا رنگ کی بنیاد پر نوکری نہیں دی جاتی اور آپ کے مقابلے میں دوسرا فرد جو آپ سے قابلیت میں تو کم ہے لیکن نسل یا رنگ کی وجہ سے اس کو ملازمت پر رکھ لیا جاتا ہے۔ یہ ملازمت کی بنیاد پر نسلی/رنگ کا

امتیازی سلوک ہے۔اس طرح ایک ہی آفس / کمپنی میں ملازمین کے ساتھ بھی نسل/رنگ کی بنیاد پر تبدلوں اور تنخواں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔

نسلی امتیازی سلوک کی ایک اہم مثال جنوبی افریقہ کے سیاہ فام قوم ہے جو ایک عرصے تک نسلی امتیاز کا شکار رہی ہے۔ جہاں سفید بالادستی پر مبنی ایک آمرانہ سیاسی ثقافت پروان چڑھی، جس نے ملک کی اقلیت سفید فام آبادی کے مفادات کے لئے سیاہ فام اور ایشیائی جنوبی افریقیوں پر ریاستی جبر کی حوصلہ افزائی کی۔ نسلی امتیاز کے معاشی وراثت اور معاشرتی اثرات آج بھی برقرار ہیں۔ سیاہ فام لوگ سفید فام لوگوں کے نشانے پر رہنے کی وجہ سے سیاست، معیشت اور معاشرے کے تمام پہلوؤں میں امتیازی سلوک کی زد میں رہے ہیں۔

> "نسلی امتیاز دستوری— یا انتظامی— سطح پر وقوع پذیر ہو سکتا ہے، بنیادی قوانین اور انتظامی ڈھانچوں سے جو شعوری طور پر امتیازی سلوک کیلئے تیار نہ کئے گئے ہوں یا شعوری طور پر ان کا مقصد امتیازی سلوک نہ ہو۔ نسل پرستی کے شکار افراد اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر کے ایک مخصوص پس منظر کے حامل افراد کے خلاف ادارہ جاتی پالیسیوں اور انتظامی ڈھانچوں میں مسائل پیدا کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے پورے ادارے کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔"[20]

اس وجہ سے اسلام ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو دنیا میں سب سے پہلے اسلام نے ہی عدم مساوات کی دایور کو توڑ ڈال۔ معاشرے میں انسانی حقوق اور مساوات میں شرکت اسلام کا انقلابی تصور تھا۔ جس نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا ہے۔ اسلام کے آنے سے پہلے اس دنیا میں معاشروں اور تہذیبوں میں انسانی نسلوں کے درمیان عدم مساوات کا رواج تھا۔ یہودی لوگ خود اعلیٰ نسل کہتے تھے اور ساتھ میں خود اللہ تعالیٰ کی اولاد سمجھتے تھے۔ وہ اپنی مذہبی کتاب کے مطابق اپنے آپ کو اس زمین کی بہترین مخلوق تصور کرتے تھے اور دوسروں کو زلیل اور حقیر سمجھتے تھے۔ رومن امپائر جو اس زمانے کی سپر پاور کہلاتی تھی اس نے سماج/معاشرے کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

۱۔ امراء جنھیں بغاوت کے سوا کسی بھی جرم کی سزا نہیں دی جاتی تھی۔

۲۔ متوسط طبقہ جسے معمولی جرائم کی آزادی حاصل ہوتی ہے

۳۔ نچلا طبقہ جس کو ذرا سی غلطی پر قتل کر دیا جاتا۔

ایرانی لوگ اپنی قوم کو عظمت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ وہ دنیا کی ہر نسل اور قوم پر انھیں برتری حاصل ہے۔اس لیے یہ باقی قوموں کو بڑی حقارت وذلت سے دیکھتے تھے۔ان لوگوں کو ایسے الفاظ سے پکارتے تھے جن میں توہین اور تمسخر پایا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان میں بھی نسلی امتیاز بلد سطح پر پایا جاتا تھا۔ہندی سماج/معاشرے کو تقسیم کیا گیا تھا۔ یہاں پر سب سے بیتر برہمن سمجھے جاتے تھے۔یہ لوگ مذہبی رہنمائی اور پیشوائی کا کام سرانجام دیتے تھے۔دوسرا طبقہ چھتریوں کا تھا جو برہمن سے کم درجہ رکھتے تھے۔یہ لوگ لڑائی اور دفاع کا کام کرتے تھے۔پھر تیسرا طبقہ ویش کا تھا جو زراعت کے پیشے سے وابستہ تھے اور چوتھا طبقہ شودر کا تھا۔یہ طبقہ سب سے زیادہ حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا تھا۔اس طبقے کے لوگ ان تین طبقوں کے لوگوں کی خدمت کرتے تھے۔اس نظام کے اثرات آج بھی ہندوستان میں کہیں کہیں پایے جاتے ہیں۔

عرب میں بھی قبائلی تعصب اور جتھ بندی زیادہ پائی جاتی تھی۔اس بڑی وجہ عصبیت تھی۔وہ لوگ ایک دوسرے رسومات میں شرکت نہیں کرتے تھے۔پھر ایک دن ایسا آیا کہ مکہ کی وادی سے یہ نوید سنائی دی کہ تمام انسان برابر ہیں کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں ہے۔کہا گیا کہ سارے انسان اللہ کی مخلوق ہیں۔سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، کوئی پیدائشی معتبر نہیں اور نا کوئی پیدائشی حقیر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے؛

> ترجمہ: اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیں۔"[21](سورۃ النساء،4:1)

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوا ہے کہ:

> ترجمہ: اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی کی اولاد کو عزت بخشی ہے اور انھیں خشکی اور سمندر دونوں میں سواریاں مہیا کی ہیں اور ان کو اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا کی ہے۔"[22](سورۃ الاسراء17،70)

قرآن کی اس آواز پر عربوں کی موروثی نخوت پارہ پارہ ہوگئی۔پھر عرب کے جنگ جو اور اکھڑ مزاج لوگ باہم شیر وشکر کی طرح ہوگئے۔ان کا سارا نسلی غرور جاتا رہا۔آگے چل کر انھوں نے مدینہ منورہ میں تاریخی مواخاۃ (بھائی

چارہ) قائم کیا جو انسانی تاریخ کا ایسا نقشِ جمیل ہے جو رہتی دنیا تک مساوات واخوت کے علمبرداروں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت سے یاد رکھتا جائے گا۔

دنیا بھر میں آج جس جمہوریت اور مساوات کا ذکر ہو رہا ہے وہ سراسر اسلامی نظام کی دین ہے۔ اسلام نے ہی پوری انسانی برادری میں مساوات اور اخوت کا نعرہ صرف بلد نہیں کیا بلکہ اس کو عملی شکل میں کر کے دیکھا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو مغربی ممالک بیسویں صدی میں نسلی امتیاز کی زد میں رہے ہیں۔ اہل یورپ نے ساؤتھ افریقہ کو اس تفریق میں مبتلا کیا تو وہ 1994 تک اس کے نشانے پر رہے اور آج بھی وہاں پر نسلی امتیاز کے اثرت باقی ہیں۔ اس طرح امریکہ جو خود کو جمہورت اور مساوات کا علمبردار کہتا ہے اس کی آج بھی بعض ریاستیں نسلی امتیاز کے قوانین کی بنیاد پر قائم ہیں۔ امریکہ کی ریاستوں میں شہریت کی مختلف درجات ہیں اور اس وجہ سے ان کو سہولتیں دی جاتی ہیں۔ آج بھی وہاں کی اکثر ریاستوں میں کالی رنگت اور گوری رنگت والی نسلوں کی آپس میں شادیاں نہیں ہوتیں ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ پھر سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ نسلی امتیاز کا نتیجہ ہے کہ امریکہ سیاہ فام نسل آبادی کے لحاظ سے حکومت میں اہم ملازمتوں اور عہدوں میں اس کا تناسب کم ہے۔ ان باتوں سے یہ وضاحت ہوئی ہے کہ مغرب جمہورت اور مساوات کے دعووں کے باوجود نسلی امتیاز آج تک ختم نہیں کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اور اسلام نے اس کو مختصر مدت میں ہمیشہ کے لیے مٹا دیا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

۲۔ صنفی امتیاز:

اس روئے زمین پر انسانی ارتقاء کو دیکھیں تو اس میں مرد اور عورت ذات لازم وملزوم ہیں۔ مگر پہچان اور جنسی اعتبار سے دونوں الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ عورت سماج کا ایک اہم رکن ہے لیکن اس کو معاشرہ صنف کی وجہ سے مرد سے کم اہمیت و مقام دیتا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی عورت ذات کو مرد سے کمتر تصور کیا جا رہا ہے۔ قدیم یونان کی تہذیبوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس دور میں بھی عورت کو اصل مقام و عزت نہ ملی جس زمانے میں بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے تھے۔ ذلیت اور رسوئی ہمیشہ عورت کا مقدر رہی ہے۔ عورت کو صرف مرد کی نسل بڑھانے، خدمت کرنے اور اس سے جنسی حظ اٹھانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مختلف فلسفیوں نے عورت ذات کو کمتر سمجھتے ہوئے کچھ یوں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

بقول ٹیولسن:

"عورت جہنم کا دروازہ ہے اور تمام تر برائیوں کی ماں ہے۔"[23]

اس طرح پروفیسر ندارا بھی کا بیان ہے:

"دنیا میں عورت سے زیادہ گناہ گار کوئی شے نہیں ہے عورت تمام خرابیوں اور برائیوں کی جڑ ہے۔"[24]

ارسطو اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"فطری طور پر مرد عورت سے برتر ہوتا ہے وہ حاکم ہوتا ہے جبکہ عورت محکوم۔"[25]

اس قدر یونانی تمدن میں صنفِ نازک قانونی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی حقوق سے محروم تھی۔ رومن تہذیب میں بھی عورت زمرۂ انسانیت سے خارج تصور کی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ انگلستان میں کمزور اور بدصورت لڑکیاں سرِ دار چڑھادی جاتی تھیں۔ ایران میں عورتوں کو باعثِ شرم وندامت سمجھا جاتا تھا۔ عرب میں قبل از اسلام عورتوں کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی جاتی اور ان کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں عورتوں کا برا حال تھا۔ بیوہ مستحقِ طعن و تشنیع سمجھی جاتی اور عموماً شوہر کے ساتھ ستی ہونے پر مجبور کی جاتی۔ الغرض! ایک ظالمانہ ماحول تھا، صنفِ نازک ظلم و ستم کے بوجھ تلے کراہ رہی تھی، ہر جگہ اس کے اخلاقی و معاشرتی حقوق پامال کیے جاتے تھے۔

کسی کو جنس یا صنف کی وجہ سے امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جائے۔ یہ تب ہوتا ہے جب ہم جنس یا صنف کو پیدائشی طور پر دوسری جنس یا صنف کو بہتر سمجھنے لگتے ہیں۔ صنفی امتیاز بچے کی پیدائش سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کو توقعات، وسائل اور مواقع تک رسائی کے حوالے سے غیر مساوی صنفی اصولوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس کے تاحیات نتائج ہوتے ہیں۔ ان کے گھروں، اسکولوں اور برادریوں میں۔ مثال کے طور پر لڑکوں کو اکثر اسکول جانے اور کام کی تیاری کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے، جب کہ لڑکیوں پر گھریلو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو انھیں اسکول سے دور رکھتی ہیں، جس سے بچپن کی شادی اور حمل کی مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے۔۔ حالاں کہ مرد اور عورت دونوں اصناف آدم کی نسل سے ہیں اور ان دونوں کی اپنی اپنی اہمیت و قدر ہے۔ اس کے باوجود ان کو جنسی یا صنفی طور پر امتیاز کا نشانہ بنانا ایک تکلیف دے بات ہے۔ آج کے نام نہاد لبرل زمانے میں بھی صنف کی بنیاد پر افراد کو اپنے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے۔۔ بیسویں صدی سے Inequality کی ٹرم باقاعدہ جانی جانے لگی تھی اور مرد اور خواتین کی مساوات ہوا چلنے لگی۔ پھر اس سے لوگوں میں شعور بیدار ہوا کہ حقوقِ انسانی، خصوصاً حقوقِ

صنفِ نازک، بھی معاشرتی نظام کا حصہ ہیں اور یوں ہم نے Gender Equality یا Gender Discrimination جیسے الفاظ سے نیا ناتا جوڑ لیا۔

تحریکِ حقوق نسواں نے معاشی اور سیاسی رجحان حاصل کرنے کے بعد "تانیثیت" کی تحریک میں تبدیل ہو گی۔ تانیثی تحریک نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے انداز اتنی وسعت پیدا کرلی کہ زندگی ہر شعبے میں عورت کو اس کی عزت اور مقام دینے کی کوشش شروع کر دی۔ اس تحریک نے عورت کے حوالے سے اتنے مسائل کو اجاگر کیا ہے کہ اس کی ایک جامع تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔

Feminist Frameworks: Building Theory against Violence on women کی مرتبہ لیزا ایس پرائس (Lisa s.Price) فیمنزم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> " Feminism is also a method of analysis ,a standpoint,a way of looking at the world from the Prospective of Women.It Questions govenrment Policies ,Popular culture,ways of doing and being,and asks how women's lives are affected by these ideological and institutional practices"[26]
>
> (Feminism: P:1,Arpita Mukhopadhyay,Orient Blackswan 2016)
>
> "فیمنزم، تجزیہ کا طریقہ کار ہے، ایک نظریہ ہے اور دنیا کو عورت کی نظر سے دیکھنے کا طریقہ ہے۔ فیمنزم حکومتی پالیسی، مقبول عام ثقافت، عمل اور وجود کے حوالے سے سوالات قائم کرتی ہے۔ ان نظریات اور ادارہ جاتی اعمال کے باعث عورت کی زندگی پر کیا اثر ہوتا ہے اس سے بھی بحث کرتی ہے۔"

مگر اس تانیثی تحریک صدہا سال قبل ہمارے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے جو عورت کو سماج میں عزت و مقام دیا اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اسلام کا معاشرتی حوالے سے یہ ایک اہم کارنامہ ہے کہ عورتوں کو جائز حقوق دیے اور انہیں تحفظ فراہم کیا۔ اسلام نے اس زمانے میں عورت کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْف"[27]

ترجمہ: عورتوں کے ساتھ بھلے انداز میں زندگی بسر کرو۔ (سورۃ النساء ۴:۱۹)

اسی حوالے سے حدیث پاک ہے:

"بیٹیوں اور بہنوں کی تعلیم و تربیت پر جنت کی بشارت دی گئی"[28] (سنن ابی داؤد، کتاب الادب، حدیث: ۴۴۸۱)۔

اسلامی نظام کے اس اقدام کی روشنی میں اہل مغرب نے بیسویں صدی میں انسانی حقوق اور بلخصوص عورت کے حقوق کی تحریکیں بنائی۔ جن کا مقصد معاشرے میں مرد اور عورت دونوں کو مساوی حق دینا تھا۔ مغرب میں صنفی امتیاز کے خلاف قوانین بھی تیارے کیے گئے لیکن اس کے باوجود آج بھی صنفی امتیاز کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو موجود جدید دور میں بھی خواتین کو سکول، دفتر، سیاست اور دیگر معاشرتی صورت میں صنفی امتیاز کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ بہت ساری لڑکیاں، خاص طور پر غریب ترین خاندانوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کو اب بھی تعلیم، بچوں کی شادی اور حمل، جنسی تشدد اور غیر تسلیم شدہ گھریلو کام میں صنفی امتیاز کا سامنا ہے۔

صنفی مساوات نہ صرف ایک بنیادی انسانی حق ہے بلکہ ایک پرامن، خوشحال اور پائیدار مستقبل کے لیے ضروری بنیاد ہے۔ صنفی مسائل کو ختم کرنے کا مطلب ایک ایسی دنیا ہے جہاں خواتین اور مرد، لڑکیاں اور لڑکے سبھی مساوی حقوق، وسائل اور مواقع سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لڑکوں کو شروع سے بااختیار بنانا ان کی زندگی کے دوران دیرپا اور پیچیدہ فوائد کا حامل ثابت ہوتا ہے۔ جب لڑکوں کو شہری اور سیاسی جگہوں پر سرگرم رہنے کے لیے مدد کی جاتی ہے، خاص طور پر، وہ اپنے خاندانوں اور برادریوں میں مثبت تبدیلی کے لیے ڈرائیور بننے کے لیے ضروری اوزاروں اور مہارتوں سے بااختیار بنایا جاتا ہے۔ لڑکیاں اپنے تجربات، ترجیحات اور ضروریات کی ماہر ہوتی ہیں، اور ایک ایسی دنیا کے لیے طاقتور ازیرک ہوتی ہیں جہاں صنفی مساوات پروان چڑھتی ہے۔ جب لڑکیوں کو اپنی زندگی گزارنے، اپنے ذہن کی بات کرنے اور اپنے مستقبل کا تعین کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے، تو سب کو فائدہ ہوتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب ہم صنفی جبر سے لڑتے ہیں تو معاشرے زیادہ مستحکم، محفوظ اور خوشحال ہوتے ہیں، خوش، بہتر تعلیم یافتہ شہری ہوتے ہیں۔

۳۔ مذہبی امتیاز:

مذاہب کا تصادم معاشرے میں عدم برداشت اور نفرت کو ہوا دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کو کسی خاص مذہب سے تعلق کی بنا پر امتیاز کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جو کہ مختلف معاشرتی برائیوں کا سبب بنتا ہے اور یہ معاشرے میں انصاف، مساوات اور رواداری کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے ہی مذاہب ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار رہے۔ کبھی آسمانی مذاہب زمینی مذاہب سے تو کبھی ایک دوسرے سے جیسے عیسائی اور یہودی روم میں اور پھر

عیسائی، یہودی اور مسلمان ایک دوسرے سے رہے۔ جیسا کہ عرب کے شہر مکہ میں پیغمبر اسلام نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور لوگ جوک در جوک مسلمان ہونے لگے تو کفار اور مشرکین نے پیغمبر اسلام اور ان کے ساتھوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ مذہبی امتیاز کی بنیاد پر تھا۔ وہ کونسا ظلم تھا جو کفار مکہ نے نو مسلم طبقے پر نا کیا ہو۔ یہاں تک نو مسلم مکہ چھوڑ کر دوسرے شہروں کی جانب ہجرت کرنا شروع کر دی تھی۔

اس کے علاوہ مذہبی امتیاز کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔ دنیا بھر میں مذہب کی وجہ سے لوگوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا جارہا ہے۔ پوری دنیا میں مذہب کی بنیاد پر سماجی نفرت کو ہوا دی گئی۔ مخالف عقیدے کے افراد کے ہاتھوں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگوں کے خلاف تشدد اور امتیاز میں اضافہ ہوتا رہا۔ چاہے وہ 1857 کی جنگ آزادی ہو یا 1947 کی پاک و ہند تقسیم ہو مذہبی امتیاز اور تشدد سے صدہزار افراد موت کا لکما بنے ہیں۔ اس حوالے سے مسلمان سر فہرست ہیں۔ جن کو ہر جگہ اور ہر معاشرے میں مذہبی امتیاز کا سامنا رہا ہے۔

طبقاتی امتیاز:

سماج کو تین طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انسانوں کا وہ گروہ جن کا طرز زندگی تقریباً ایک جیسا ہو اور ان کی ایک جیسی معاشی صلاحیت ہو وہ ایک مخصوص طبقہ یا کلاس کہلاتی ہے۔ ان طبقات کے افراد ایک دوسرے میں فرق کرتے ہیں۔ یعنی اعلیٰ طبقے کے لوگ مڈل کلاس (درمیانے) اور نچلے طبقے والوں کو اپنی صف میں شامل کرنا برداشت نہیں کرتے۔ اس طرح مڈل کلاس والے نچلے طبقے والوں کو طبقاتی امتیاز کی وجہ سے دور رکھتے ہیں۔

کارل مارکس نے معاشی بنیادوں پر معاشرے کو طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرے میں معاشی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم مختلف طبقات کو جنم دیتی ہے اور ان تمام طبقات کی بقاء اس میں ہے کہ وہ دوسرے طبقات سے لڑتے رہیں اور اس نے معاشرتی تبدیلی کے لیے فقط معاشی ترقی کو اہم قرار دیا ہے۔ جیسے مذہبی، سیاسی، لسانی اور ثقافتی تقسیم کی بنیاد پر آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ یوں ہی معاشی تقسیم کی بنیاد پر لوگ لڑتے ہیں اور اپنے اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں۔

اعلیٰ طبقے (اشرافیہ) کو احساس برتری کی وجہ کبھی برابری کی طرف سوچنے نہیں دیا ہے۔ اشرافیہ کے افراد کی سوچ باقی سماج کے لوگوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اختیارات، دولت اور آسائشوں کی فراوانی کی وجہ وہ ایک مخصوص ذہنیت رکھتے ہیں۔ جس کی بنیاد پر وہ سماج کے باقی افراد سے خود کو برتر اور اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ جیسا وطنِ عزیز میں موجود اشرافیہ اپنی جاگیروں پر نسل در نسل کام کرنے والے مزارعوں، ہاریوں اور انکی بیوی بچوں کی قسمت کے مالک ہونے کے باعث ان کا رشتہ آج بھی آقا اور غلام والا ہے۔ کئی کئی ایکڑ زمینوں اور گدیوں کے ملکیت کے ساتھ اس میں آباد

مزاغ اور ہاری ان کی ذاتی رعایا شمار ہوتے ہیں۔ جن کی جان، مال اور عزت کے یہ مالک بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے کتوں کو غلام (نوکروں) سے زیادہ عزت اور راتب دیتے ہیں۔

متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد تعلیم، ٹرننگ، دماغی صلاحتیوں اور اخلاقی اقدار کے مالک ہوتے ہیں۔ یہی لوگ سماجی ترقی اور حرکت پذیری کے لئے ہمیشہ متحرک رہتے ہیں۔ اس طبقے کے افراد اپنی صلاحیتوں اور ٹیلنٹ کا اظہار اور اس کی نشو و نما چاہتے ہیں اور اس کی وجہ سے اعلیٰ معاشی و سماجی مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے سب سے بڑا محرک اپنے مقصد کا حصول ہوتا ہے۔ سماج میں اس طبقے کے افراد اعلیٰ صلاحیتوں، اعلیٰ ذہین رکھنے والے اور پر عزم ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ معاشرے کی ترقی کے لیے اہم ہوتے ہیں۔

نچلا طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد غریب ہوتے ہیں بلکہ غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی امید، خوشی اور خوشحالی کی کرن نظر نہیں آتی ہے۔ ان کی زندگی مسلسل سماجی جبر کا شکار رہتی ہے۔ ان لوگوں کا صرف ایک ہی مقصد صبح شام کی روٹی برابر کرنا ہوتا ہے۔ اس طبقے کے افراد کی بہتری کے لئے سماج میں کوئی اجتماعی کوشش نہیں کی گئی۔ اس طبقے کے لوگوں تک معاشی، معاشرتی اور تعلیمی حوالے کوئی ثمرات نہیں پہنچ سکے ہیں۔ سب سے زیادہ یہی طبقہ امتیازی سلوک کا نشانہ بنتا ہے۔

اس طرح فریڈرک نطشے نے معاشرے کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے کہ ان کو حیثیت اور صلاحیت کے مطابق کام تفویض کئے جائیں۔

۱۔ پیداواری لوگ مثلاً کسان، مزدور، تاجر وغیرہ۔

۲۔ ورکنگ کلاس: حکومتی اداروں کے اہلکار اور سپاہی وغیرہ۔

۳۔ حکمران: جو کہ فلاسفر، سوچنے والے اور وہ بلند کردار و معیار کے مالک ہوں۔ اس طرح کی تقسیم سے معاشرے میں ہم آہنگی اور بہتری پیدا ہو سکتی ہے جبکہ بد قسمتی سے یہ ہمارے معاشرے میں طبقاتی تقسیم اس بنیاد پر نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے معاشرہ انتشار کا شکار ہے۔

مذاہب کے اندر بھی طبقاتی تقسیم موجود ہے۔ جیسے برصغیر پاک ہند میں ہندو مذہب میں طبقاتی امتیاز موجود ہے۔ ہندو مذہب برہمن، چھتری/ کھتوی، ویش اور شودر طبقات میں تقسیم ہے۔ یہ پیشوں کے لحاظ سے طبقات بنائے گئے تھے اور آج تک موجود ہیں۔ اس امتیاز کو بدھ مت نے مٹانے کی کوشش کی مگر یہ ختم نہیں ہو سکا۔ بدھ مت کی اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اچھوت قومیں وجود میں آئیں جن کی وجہ سے عام آدمی انسانی حقوق سے محروم ہو گیا ہے۔

فرقہ وارنہ امتیاز:

فرقے کا لفظ "فرق" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی جدا ہونا یا الگ کرنا کے ہیں۔ یعنی فرقہ کسی بھی مذہبی یا سیاسی جماعت کا وہ چھوٹا حصہ ہوتا ہے جو نظریات و خیالات کی بنیاد پر علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کو فرقے کا نام دیا جات ہے۔

اس دنیا کے تمام مذاہب میں فرقہ بندی موجود ہے۔ چاہئے وہ عیسائیت ہو، سکھ ہو، ہندومت ہو، جین مت، بدھ مت ہو یا پھر اسلام ہو سب میں فرقہ واریت شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ صرف مذہبی یا سیاسی حوالے سے فرقے ہوں بلکہ بعض فرقے علم کی اور انا پرستی کی بنیاد پر لوگ بنا لیتے ہیں۔ جب کبھی کسی اہل علم کی رائے کو عوام میں زیادہ پذیرائی ملنے لگتی ہے تو اسکی دلیل کے ماننے والے افراد زیادہ ہو جاتے ہیں تو وہ ایک فرقے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور انا پرستی میں آکر سکھوں نے بہت سے فرقے بنائے ہیں۔ انا پرستی کی وجہ سکھوں کے مشہور فرقے سکھ گروؤں کی اولادوں نے اپنی اپنی گدی قائم کرنے کے لئے بنائے ہوئے ہیں۔ جیسے نانک پنتھی فرقہ بابا گروہ نانک کی اولاد نے بنایا کیونکہ گرو کا عہدہ انہیں نہیں ملا بلکہ بابا نانک کے دوست گروانگد کو ملا تھا۔ گروہری رائے اور گرورام داس کی اولاد نے اویسی، نام دھاری اور خالصہ نام کے فرقے بنا لیے تھے۔

ہمارے اپنے مذہب اسلام میں فرقہ بندی کا آغاز رسول اللہ ﷺ کی وراثت کے مسئلے سے ہوا۔ اسلام کا پہلا فرقہ جو رسول اللہ ﷺ کی وراثت کے مسئلے کی بنیاد پر وجود میں آیا اس کو شیعانِ علی کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ فرقہ اس وقت سیاسی اختلاف کی وجہ سے بنا تھا۔ مذہبی وجہ سے تو فرقے بہت بعد میں وجود میں آئے۔ جب حضرت علیؓ زمانہ خلافت میں ایک فرقہ بنا جس کو تاریخ میں خوارج کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔ غلام اصغر خان اپنی کتاب "نظریہء قومیت (عالمی و مقامی تناظر) میں لکھتے ہیں۔

> "اس میں اولاً ایک تقسیم رحلتِ پیغمبر اسلام کے بعد انتقالِ اقتدار کے قضیے پر ہوئی جس میں اولادِ رسول ﷺ اور اصحابِ رسول ﷺ کے حامی ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور اپنی سیاسی وابستگی کی بنیاد پر اپنی شناختیں بنالیں۔ دوسری تقسیم خلیفہء سوم کے قتل پر سامنے آئی جس میں بنوامیہ نے علی ابن ابی طالب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس کے بعد اسلام کی تاریخ میں تیسری تقسیم 10 محرم 61 ہجری (10 اکتوبر 680ء) کو پیش آنے والے واقعہ کربلا کے بعد ہوئی جس میں ملتِ اسلامیہ حسینی اور یزیدی بلاکوں میں

بٹ گئی۔ یہ تقسیم آج تک قائم ہے بل کہ یوں کہیں کہ واقعہ کربلا کے بعد اسلام میں یہی
دو فرقے ہی ہیں جن میں کبھی بھی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔"[29]

ہمارے معاشرے کو لاحق ایک سنگین مسئلہ مذہبی فرقہ واریت کا ہے۔اس فرقہ واریت کی بنیاد پر مخالف فرقوں کے افراد کا قتل،ان کی عبات گاہوں پر حملے اور مخالف فرقے کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے نامور افراد کا قتل معاشرے میں خوف و بے سکونی کا سبب بن رہے ہیں۔ یہ مذہبی فرقہ واریت معاشرے کے تمام گوشوں میں پھیل چکی ہے اور پہلے سے تقسیم در تقسیم اور کمزور معاشرے میں اس فرقہ بندی نے انتہائی نچلی سطح تک لوگوں میں مزید خلیج حائل کر دی ہے۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ تر متشدد فرقہ وارنہ واقعات دو اہم فرقوں سنی اور شیعہ کے درمیان ہو رہے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ دہلوی، مولوی سید احمد۔فرہنگ آصفیہ، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1967ء۔

2۔ ریختہ۔اردو ڈکیشنری ایپ۔

3۔ ابن خلدون، عبدالرحمان۔ مقدمہ ابن خلدون،مترجمہ:راغب رحمانی دہلوی، کراچی: نفیس اکیڈمی، 1970ء، ص108۔

4۔ ابن خلدون، عبدالرحمان۔مقدمہ ابن خلدون،مترجمہ:سیدحسن خان یوسفی، کراچی: نور محمد اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب، ص154۔

5۔ ایضا، ص157۔

6۔ سید احمد خان، سر۔انتخاب مضامین سرسید، ریختہ ویب سائٹ۔

7۔ غلام اصغر۔نظریہء قومیت، لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2022ء، ص75۔

8۔ عمادی، محمد عبدالقادر۔نسل اور نسلی امتیازات، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1984، ص54۔

9۔ القران، سورۃ الحجرات 13:49۔

10۔ القران، سورۃ انفال، آیت نمبر 36۔

11۔ القران، سورۃ الحجرات آیت نمبر 10۔

12۔ غلام اصغر۔نظریہء قومیت:عالمی و مقامی تناظر، لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2022ء، ص80۔

13. Johann Gottlieb Fichte, Addressess to the German Nation (Chicago: Open Court,1992),p.215۔

14۔ اسٹالن۔قوم اور قومیت، لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2020، ص7۔

15۔ غلام اصغر۔نظریہء قومیت:عالمی و مقامی تناظر، لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2022ء، ص90۔

16۔ حسنین کاظمی۔اوراقِ فیض، مشمولہ:ہماری قومی ثقافت، کراچی: ادارہ یادگارِ غالب، 1976ء، ص18۔

17۔ غلام اصغر۔نظریہء قومیت:عالمی و مقامی تناظر،لاہور:عکس پبلی کیشنز، 2022ء، ص151۔

18۔ ایضاً،ص83،82۔

19. Pascoe, E. A. & Richman, L. S. (2009). Perceived discrimination and health: A meta-analytic review. Psychological Bulletin 135(4): 531-554. Doi: 10.1037/a0016059۔

20.https://www3.ohrc.on.ca/ur/ur/%D9%86%D8%B3%D9 %84 %DB%8C-1%D8%A7%D9%85%D8%AA%DB%8C%D8%A7%D8%B2-racial-discrimination

21۔ القران،سورۃالنسا،4:1۔

22۔ القران،سورۃالاسراء17،70۔

23. Swami Madhavanada;R.C. Majumdar great woman at India , Imora, 1953, P,1-2.

24. Indra, M.A Status at woman in Ancient. India Banoras 1955,P.12.

25. Joggar Alison, M.Feminist Politics and Human Harvestor Pressitd(uk) 1983,P.136.

26. Feminism: P:1,Arpita Mukhopadhyay,Orient Blackswan 2016.

27۔ القران،سورۃالنساء۴:۱۹۔

28۔ سنن ابی داؤد،کتاب الادب،حدیث:۴۴۸۱۔

29۔ غلام اصغر۔نظریہء قومیت:عالمی و مقامی تناظر،لاہور:عکس پبلی کیشنز، 2022ء، ص161۔

باب دوم:

''ادھ ادھورے لوگ'' اور ''کرک ناتھ'' میں عصبیتوں اور امتیازات کی مختلف صورتیں

محمد حفیظ نے ادھ ادھورے لوگ بیک وقت سرائیکی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہے۔ اس ناول میں مذہبی تعصب، معاشرتی جبر، انتہا پسندی، تقسیم برصغیر کے بعد ہونے والے فسادات اور پاکستان میں ون یونٹ بننے سے پیدا ہونے والا قومی تعصب و امتیاز کے ساتھ ساتھ دوسرے مسائل کو ریاست بہاول پور کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

اگست 1947ء میں برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے جو دردناک واقعات سامنے آئے ہیں شاید کسی اور خطے کی تقسیم کے دوران پیش آئے ہوں۔ اس بٹوارے نے علاقوں اور شہروں کو ہی نہیں گھروں اور خاندانوں کو بھی تقسیم کیا۔ اسی تقسیم کے باعث دونوں طرف سے جو ظلم و ستم کا بازار گرم رہا اس کی تاریخ میں کہیں اور مثال نہیں ملتی ہے۔ اس وقت کی لوٹ مار، قتل و غارت گری اور ہجرت کی دکھ بھری تصویریں آج بھی تاریخ سے زیادہ ادب کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اس تقسیم کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔

> "اس قیامتِ صغریٰ نے مذہب کے نام پر ناموسِ انسانیت کا جنازہ نکال دیا۔ تہذیب و شرافت کی بنیادیں ہلا دیں اور کٹھور سے کٹھور اور بے حس سے بے حس انسان کو جھنجھوڑ ڈالا۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں معصوم زندگیوں کی ہلاکت و دربدری اور تہذیبی، اخلاقی اور سماجی قدروں کی پامالی نے دلوں میں رخم اور آنکھوں میں ناسور ڈال دیئے۔ تخریبی، لاقانونی اور وحشی عناصر نے صدیوں کی ثقافتی میراث کی نہایت بے دردی سے شکست و ریخت اور خدا کی پیاسی زمین کو اس کے بندوں کا تازہ تازہ گرم خون اس افراط سے لایا کہ مدتوں تک ابر کرم کے چھینٹوں پر آسمان کی خون فشانی کا گمان رہا۔ اس خونی منظر کو دیکھ کر ہمارے ادیبوں کا عام لوگوں سے زیادہ متاثر ہونا بالکل فطری تھا کیوں کہ اہل قلم کی جماعت ہی قوموں کا اعصابی مرکز ہوتا ہے۔"[1]

تقسیم ہند اور فسادات کے بارے میں ڈاکٹر محمد ذاکر کا بیان کچھ یوں ہے۔

> "فرقہ ورانہ تعصب اور کشت و خون کے جو مظاہرے ان دنوں دیکھے ہیں۔ مہذب دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال شاید ہی ہو گھر کے گھر اجڑ گئے، مکان جلا کر راکھ کر دیے گئے بے گناہ مسکین دربدر مارے مارے پھرنے پر مجبور ہو گئے۔ سالہا سال سے فرقہ وارانہ منافرت کا کھولتا ہوا لاوا بہل پڑا انسانی قدریں خطرے میں پڑ گئیں۔"[2]

1947ء کے واقعات نے اردو شعراء اور ادباء کو زیادہ متاثر کیا۔ اس زمانے کے ادباء نے ناولوں اور افسانوں کی صورت ان تمام فسادات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے لگے۔ بالخصوص نفسیاتی، معاشرتی، تاریخی اور اقتصادی مسائل کو موضوع کے طور پر لیا۔ اس زمانے کی تمام تحریریں واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن ریاست بہاول پور میں ہونے والے فسادات کے حوالے سے ادب میں کچھ خاص پیش نہیں کیا گیا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے محمد حفیظ نے 2018ء میں ادھ ادھورے لوگ کے نام سے ناول لکھ کر سرائیکی اور اردو کی ادبی دنیا میں ریاست بہاول پور میں ہونے والے فسادات کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

بہاول پور ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ یہ پنجاب اور سندھ کے درمیان ہونے کے باوجود اپنی ایک الگ شناخت رکھتی تھی۔ اس ریاست کا والی نواب صادق محمد خان عباسی تھا۔ اس نے مسلمان ہونے کی بنیاد پر تقسیم کے بعد پاکستان کے ساتھ الحاق کا علان کیا تھاا ور پھر یہ ریاست ون یونٹ کی زد میں آگئی تھی۔ ریاستی اپنی شناخت کی خاطر دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوگے۔ ان سب واقعات کو محمد حفیظ نے ایک ناول کی صورت میں قلم بند کیا ہے۔

ناول کا کینوس 1947 سے 1970 تک بہاول پور کی صورت حال پر محیط ہے۔ ناول میں محمد حفیظ کا سیاسی و سماجی فہم اور مشاہدہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ناول میں تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے مذہبی، قومی اور لسانی تعصب کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ناول کے متعصب کردار خاصے متحرک ہونے کی وجہ سے ناول کے کینوس پر موجود رہتے ہیں۔ محمد حفیظ نے اپنے مرکزی کردار فیاض حسین اور ایک ضمنی کردار وادھو کے ذریعے سے ریاست بہاولپور میں پایا جانے والا مذہبی اور قومی تعصب کو اجاگر کیا ہے۔

فیاض حسین:

فیاض جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ جس کو ناول میں ہیرو کا درجہ بھی حاصل ہے۔ فیاض مسلم مذہب سے تعلق رکھتا ہے اس کا باپ نذیر حسین نواب آف بہاول پور کا باڈی گارڈ ہوتا ہے۔ جب فیاض میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوتا ہے تو اس کے باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ میرا بیٹا بھی نواب صاحب کے حفاظتی دستے میں شامل ہو کر نواب کا خدمت گار بن جائے۔ نذیر حسین چند دن فیاض کو اپنے ساتھ پریڈ کے لیے لے جاتا رہا لیکن فیاض ایک دن یہ ملازمت کرنے سے انکار کرتا ہے تو باپ اس کو کسی اور ہنر سیکھنے کے لیے کوشش کرتا ہے۔ ایک دن فیاض بیمار ہو جاتا ہے اور باپ اس کو حکیم رام لعل کے پاس لے جاتا ہے۔ فیاض حکیم کی دوا سے جیسے صحت مند ہوتا ہے تو پھر وہ اپنے باپ

نذیر حسین سے کہتا ہے کہ اس کو حکیم رام لعل سے حکمت سیکھنی ہے اور کوئی کام نہیں کرنا ہے۔ پھر اس بات پر جو باپ اور بیٹے کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے اس کو ناول نگار نے یوں پیش کیا ہے:

"نذیر حسین نے ہڑبڑا کر پہلے تو غور سے بیٹے کو دیکھا اور پھر یقین نہ کرنے والے انداز میں اسے مخول سمجھتے ہوئے زور کا قہقہہ لگا دیا۔ ایک طویل قہقہہ مسکراہٹ میں بدلا تو حیرت سے اس کا منہ تکتے بیٹے کو ایک بار پھر ہنسی ہنسی میں یوں اڑانے کی کوشش کی کہ بھل بھئی جوان بھل، دولہے صادق سئیں کے باڈی گاڈ ر نذیر حسین کا شیر جیسا بیٹا اب حکمت سیکھے گا اور وہ بھی اس کراڑ سے بابا سئیں! اگر وہ کِراڑ دوا دارو کر سکتا ہے تو اس سے حکمت سیکھنے میں کس بات کا لحاظ یا کس بات کی شرم۔ فیاض کی آواز میں بھلے اترے بخار کی نقاہت تھی لیکن اس کی آواز میں پنہاں عزم سے صاف لگ رہا رتھا کہ جو وہ طے کر چکا ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹنے والا۔

مگر بیٹا حکیم رام لعل صرف کِراڑ ہی نہیں، سخت گیر اور خبطی بھی ہے، وہ تمہیں کیونکر شاگرد بنائے گا۔ نذیر حسین نے ایک بار پھر راستہ روکنے کی اپنی سی کوشش کی۔

"چھوڑیں۔۔۔ نہ کہیں آپ۔۔۔ میں خود ہی بات کر لیتا ہوں حکیم صاحب سے"۔ اتنا کہہ کر فیاض حسین اٹھ کھڑا ہوا مگر نذیر حسین حیرت زدہ سا سوچتا ہی رہ گیا کہ آخر لڑکے کو ہو کیا گیا ہے۔ بیٹے کو ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر اس نے فیاض کو آواز دی " ٹھہر او پتر ٹھہر۔۔۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ، تو کرا کے چھوڑے گا مجھ سے ترلے اس کِراڑ حکیم کے۔"3

اس اقتباس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہندو و مسلم ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مذہبی تعصب رکھتے تھے۔ یہ اور بات کہ کسی میں کم تو کسی میں زیادہ تعصب پایا جاتا تھا۔ جیسے اوپر عبارت میں نذیر حسین جو اپنے بیٹے کو حکیم صاحب کی شاگردی اس لیے اختیار نہیں کرنے دیتا وہ حکیم ہندو ہے۔ حالانکہ اس ہندو حکیم سے بیماری کی صورت میں دوا دارو لینے سے نذیر حسین کو برا نہیں لگتا لیکن جب بیٹا اسی حکیم سے ہنر سیکھنے کی بات کرتا تو باپ کا مذہبی تعصب جاگ اٹھتا ہے۔

جب فیاض حکیم رام لعل کا شاگرد بن جاتا ہے تو کچھ ہی دنوں میں حکیم صاحب کا اعتماد جیت لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے فیاض کا حکیم صاحب کے گھر کام کے سلسلے میں آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ حکیم کا گھر احمد پور میں تھا جہاں حکیم اپنی اکلوتی بیٹی تلسی اور اپنی بیوی رادھی کے ساتھ زندگی گزر رہا تھا۔ حکیم صاحب سورج کے نکلتے ہی ڈیرہ نواب کے بازار میں اپنے مطب پر آتا اور پھر دن بھر مریضوں کا دوادارو کرنے کے بعد عشاء کے وقت گھر کو جاتا تھا۔ فیاض جیسے شاگرد کی وجہ سے حکیم کی پریشانیاں اور ذمہ داریاں پہلے کی نسبت کم ہو گی تھی۔ اب حکیم ایک تو عصر کے وقت مطب فیاض کے حوالے کر خود گھر چلا جاتا تھا اور دوسرا دن کو اگر کوئی چیز گھر احمد پور بھیجنی ہوتی تو فیاض کو کہتا کہ جا کے دے آئے۔ جب فیاض گھر سامان دینے جاتا تو حکیم کی بیوی جو مذہبی تعصب میں مبتلا تھی وہ فیاض سے نفرت کرتی تھی۔ وہ اکثر اپنے شوہر حکیم رام لعل سے کہتی کہ مسلمان لڑکے کے ہاتھوں گھر سامان نہ بھیجا کرے کیونکہ چیزیں ناپاک ہو جاتی ہیں۔

> "تلسی کا دل بیٹھ سا گیا۔ ضرور اس کے باپ نے فیاض کے ہاتھ کوئی چیز گھر بھیجی ہو گی مگر اس کی ماں کو کسی مسلمان کی چھوئی ہوئی چیز سے اس طرح نفرت تھی کہ جیسے اس کا سب کچھ بدبودار کچرے کی روڑی بن گیا ہو۔
>
> اماں! فیاض ہے؟۔۔۔ تلسی نے پھر بھی پوچھ ہی لیا
>
> اور کون۔۔۔ وہی ہے مویا مسلا۔۔۔ ہزار بار کہا ہے تمہارے باپ کو کہ اس کے ہاتھ گھر کوئی شے نہ بھیجا کرو مگر وہ پھر بھی اسی کو بھیج دیتا ہے۔۔۔ بڑا حکیم بنا پھرتا ہے، پاکی پلیتی کی سدھ ہی نہیں۔ تلسی کی ماں تھیلا اٹھائے بڑبڑاتی جا رہی تھی۔
>
> اماں ہولے بول۔۔۔ وہ سن لے گا۔۔۔ تلسی دانتوں کو چھپیڑ کر بولی۔
>
> تو سن لے، میری جان تو چھوٹے گی۔۔۔ یہ کہہ کر رادھی نے تھیلے کو تخت پوش پر پھینکا اور خود سقاوے کے باہر رکھی پانی کی ولٹوئی میں سے پانی منگر میں نکال کر ہاتھوں پر بہانے بیٹھ گئی۔"[4]

حکیم رام لعل کی بیوی (رادھی) جس کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔ وہ اس قدر مذہبی تعصب میں مبتلا تھی کہ مسلمانوں یا دوسرے مذہب والوں کی چھوئی ہوئی چیز کو ناپاک سمجھتی تھی۔ جیسے فیاض کے ہاتھوں آئی ہوئی چیزوں کو وہ نفرت سے دور پھینک دیتی تھی اور اپنے ہاتھوں کو پانی سے پاک کرنے لگ جاتی تھی۔ رادھی مذہبی تعصب کی وجہ سے فیاض سے نفرت کرتی تھی اور اپنے شوہر حکیم رام لعل پر غصہ ہوتی تھی۔ جس فیاض سے رادھی کو شدید نفرت تھی اسی

فیاض سے رادھی کی بیٹی تلسی کو محبت ہو گئی تھی۔ماں فیاض کے آنے پر غصہ ہوتی تو بیٹی وہی خوش ہو جاتی تھی۔ تلسی فیاض کے آنے کی انتظار میں لمحہ لمحہ بے قرار رہتی۔ تلسی نے فیاض کو پہلی بار تب دیکھا تھا جب وہ ایک سال پہلے اس کے باپ کے ساتھ ان کے گھر آیا تھا۔ تلسی فیاض کو دیکھنے کے بعد اکثر یہ سوچتی رہتی تھی کہ یہی وہ مرد ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔فیاض کو دیکھنے سے پہلے تلسی نے اپنی زندگی میں قریب سے صرف تین مردوں کو دیکھا ہوا تھا۔ایک اس کا والد حکیم رام لعل، دوسرا اس کا منگیتر وشنو اور تیسرا اس کا ہونے والا سسر سوڈھی مل تھا۔ان تینوں میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جس کے سبب وہ تلسی کو متاثر کر سکتے۔ لیکن ان کے مقابلے میں فیاض ایسا مرد تھا جس کو دیکھنے سے ہی نہیں بلکہ اس کے بارمیں سوچ کر بھی تلسی کے بدن میں مستی کی لہریں ہچکولے لینے لگتیں اور مسام مسام پسینے میں شرابور ہو جاتا تھا۔

یہ بات تلسی ضرور جانتی ہے کہ جس گھر میں ایک مسلمان لڑکے کے ہاتھ سے آئی ہوئی ہر چیز ناپاک سمجھا جاتا ہو۔وہاں یہ کیسے ممکن ہوگا کہ اس گھر کی لڑکی اس مسلمان لڑکے کے خواب دیکھے۔یعنی تلسی کو علم تھا کہ ایک مسلم مرد اور ہندو عورت کا بیاہ ہونا ممکن نہیں ہے۔

> "اتنا تو تلسی بھی جانتی تھی کہ فیاض مُسلا ہے اور ایک مُسلے اور ہندوانی کا کیسا سنجوگ۔ مگر کیا کرتی کہ سنجوگ کے امکانات نہ ہونے نے ہی اس نامعلوم سانجھ میں کچھ ایسی کشش گونڈھ رکھی تھی کہ جس نے اسے سَر سے پاؤں تلک "فیاض" بنا رکھا تھا۔"[5]

تلسی پھر بھی ہر وقت فیاض کے خیالوں میں گم رہتے ہوئے سوچتی ہے کہ اپنے دل کی بات اس سے کیسے کہے۔جب بھی دروازے پر دستک ہوتی ہے تو وہ دوڑ کر اس خیال سے جاتی ہے کہ فیاض ہوگا۔ لیکن اکثر دروازے پر اس کا ہونے والا سسر سوڈھی مل ہوتا ہے۔ جو اس کے باپ کی غیر موجودگی میں ان کے گھر آتا ہے اور کئی گھنٹے اس کی ماں کے ساتھ کمرے میں گزارتا ہے۔ سوڈھی مل کے آتے ہی تلسی کی ماں کا غصہ خوشی میں بدل جاتا ہے۔ تلسی کو سوڈھی مل کا اس طرح گھر میں آنا اچھا نہیں لگتا تھا کیونکہ وہ بیٹھتا تو اس کی ماں کے ساتھ تھا لیکن اس کی نظریں تلسی کے بدن میں سوئی کی طرح چبھتی تھیں۔ جتنا وقت سوڈھی ان کے گھر میں رہتا ہے تلسی اس دوران کمرے سے باہر نہیں نکلتی کیونکہ اپنے بدن کو فیاض کی امانت سمجھتی ہے۔اس لیے سوچتی ہے کہ جلد از جلد فیاض سے مل کر اپنا آپ اس کے حوالے کر دے۔

وشنوں اور تلسی کی شادی کی تقریبتا چل رہی ہوتی ہیں کہ اچانک بہاول پور میں حکیم رام لعل کا ایک رشتے دار فوت ہو جاتا ہے۔ تلسی کے سوا سبھی وہاں جاتے ہیں اور پیچھے گھر میں تلسی کے ساتھ سہلیاں اور دو نائنیں موجود ہوتی

ہیں۔اس باوجود حکیم صاحب ایک مرد کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے فیاض کو گھر کی ذمہ داری دیتا ہے۔جب فیاض شام کو حکیم صاحب کے گھر پہنچاتا ہے تو تلسی اس سے بات کرنے کا موقع تلاش کرنے میں لگ جاتی ہے۔آخر کار رات کے آخری پہر میں تلسی فیاض کے پاس جا بیٹھتی ہے۔یہاں فیاض تلسی کے اظہارے محبت کو ٹھکرا دیتا ہے۔اس رات حکم رام لعل جس رشتے دار کی قوتگی پر گیے ہوئے ہوتے ہیں وہاں پر شدت پسند مسلمانوں اس وقت مذہبی منافرت پھیلادی۔پورے بہاول پور میں ہندوؤں میں خوف کی فضا پیدا ہو گی۔

> "جو شب تلسی اور فیاض پر بھاری گزری وہ شب ریاست بہاول پور میں مختلف مذاہب کے مابین بھائی چارے اور امن امان کی آخری شب ثابت ہوئی۔ بھگوان داس کی ارتھی بھلے ادھ رات کو اٹھائی گئی مگر انتہائی نازک حالات میں بھی کسی ناں کسی طور شرارت ہو کر رہی۔ڈسٹرکٹ بہاول پور کا سخت حکیم تھا کہ کسی طرف سے بھی مذہبی منافرت کی بات نہ ہو مگر ایک صوبیدار اور چار سپاہیوں کی نفری کی نگرانی کے باوجود کسی نے بھڑ کا لگادیا کہ ہندو اپنے مردے جلانے کے بعد ان کی چٹکی بھر راکھ تمام مسجدوں کے دروازوں کے سامنے بکھیر جاتے ہیں۔اس شوشنی کے باعث پہلا رد عمل تو یہ ہوا کہ مڑھی کے راستے میں پڑنے والے مدرسوں کے طالب علموں نے بڑے بڑے ڈھنگر اٹھا کر گزرگاہ پر رکھ دے کہ کوئی یہاں سے گزر ہی نہ سکے۔"[6]

برصغیر کی تقسیم کی خبریں سنتے ہی دونوں طرف بسنے والے انسانوں میں ایک نامعلوم سا خوف پیدا ہو گیا تھا۔اس خوف کے باعث ہزارہا سال سے ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے رہنے والے چند دنوں کے اندر ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھنے لگ گئے۔دوست، ہمسائے اور گلی محلے والے ایک دوسرے کی جان و مال کے پیاسے بن بیٹھے۔حالاں کہ ریاست بہاول پور کا والی جو ایک مسلمان تھا۔اس نے ریاست میں رہنے والے ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔لیکن اسکے باوجود ان دنوں ریاستی مسلمانوں نے اقلیتی برادریوں کو ستانا شروع کر دیا تھا۔جس کی وجہ سے کچھ ہندوں چوری چھپے کہیں ہجرت کر گئے اور باقی جو بچ گئے وہ ایک ساتھ قریب قریب رہنے لگ گئے کیونکہ مسلمانوں سے خوف آنے لگا گیا تھا۔انیتا اندر سنگھ نے اپنی کتاب(The partition of india)میں تقسیم کے واقعے کو دنیا کی تاریخ کے سب سے زیادہ طوفاں خیز اور انقلابی قرار دیتا ہے۔

> "اٹھارہوں صدی سے لے کر اب تک پورپ، ایشا، افریقہ اور مشرق وسطی میں جو متعدد تقسیمیں ہوئی ہیں، انہی میں سے ایک 1947ء کی تقسیم بھی ہے۔اس تقسیم کے ساتھ بھی مختلف مذہبی گرہوں کے مابین تشدد اور فساد برپا ہوا۔لیکن اس تقسیم کے نتیجے میں

ایسی کسی بھی دوسری تقسیم کے دوران زیادہ جانیں ضائع ہوئیں۔ ہندوستان کی تقسیم میں کتنے افراد مارے گئے، کتنے لوگ اجڑے اور بے گھر ہوئے (قطعی طور پر) کچھ پتہ نہیں، یہ تعداد دو سے لے کر تیس لاکھ تک کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ 1946ء سے 1951 کے درمیان لگ بھگ نوے لاکھ ہندوؤں اور سکھوں نے پاکستان سے ہندوستان کی سرحد میں قدم رکھا اور تقریباً ساٹھ لاکھ مسلمان ہندوستان سے پاکستان گئے۔[7]

اس طرح فرمان فتح پوری کا بیان ہے۔

"آزادی کا دیا پوری طرح روشن بھی نہ ہونے پایا تھا کہ فسادات کے نام سے برق و باد نے گھیر لیا۔ گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر قتل و غارت کی آندھیوں میں تنکے کی طرح اڑ گئے۔ بادلوں سے پانی کی بجائے خون برسنے لگا۔ گلی کوچے اور بستیاں ڈھب گئیں۔ آدمی کے روپ میں درندے نکل پڑے۔ برسوں کی یاری اور ہمسائیگی کچھ کام نہ آئی۔ سارے رشتے آن کی آن میں منقطع ہو گئے۔ باپ کے سامنے بیٹیوں کی اور بھائی کے سامنے بہنوں کی عصمتیں لوٹ لی گئیں۔ کمینگی، درندگی، حرص و ہوس لوٹ مار اور قتل و غارت کا ایسا بازار ہوا کہ تہذیبِ انسانی پانی پانی ہو گئی۔"[8]

جب پاکستان بنا تو ریاست بہاول پور کو صوبائی طور پر ساتھ شامل کر دیا گیا لیکن بد قسمتی سے آج تک وہ صوبہ نہیں بن سکا۔ 1950ء کے بعد پاکستانی حکومت اور سیاست میں بیوروکریسی نے مداخلت شروع کی تو ملک غلام محمد گورنر جنرل بن گئے اور وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کو بنا دیا گیا۔ غلام محمد نے بنگالی عوام کا گلا گھونٹنے کے لیے مغربی حصے کے تمام صوبوں کو ایک یونٹ بنا کر مغربی پاکستان کا نام دے دیا اور مشرقی بنگال کا یونٹ بنا کر اس کو مشرقی بنگال کی بجائے مشرقی پاکستان کہا جانے لگا تاکہ برابری کی سطح پر بات کی جا سکے۔ اس کا اعلان اس وقت کے وزیر اعظم نے کرتے ہوئے کہا کہ اب کوئی بنگالی، سندھی، پنجابی، پٹھان اور بہاول پوری نہیں ہو گا۔ اس اعلان سے پنجابی، پشتون، سندھی، بہاول پوری اور بنگالی ان سب میں لسانی اور علاقی تعصب اجاگر ہو گیا۔ اس اعلان کا الٹا اثر جتنا سندھ اور سرحد کی عوام پر ہوا سو ہوا مگر بہاول پور کے لوگ جو پہلے ہی اپنی شناخت کی تلاش میں دربدر پھر رہے تھے اب اس نئے طوفان میں اپنی رہی سہی شناخت بھی گنوا بیٹھے۔ 1954ء میں پاکستان کے نویں وزیر اعظم کا حلف اٹھاتے ہی چوہدری محمد علی نے نواب محمد صادق خان عباسی سے بہاول پور کے صوبہ مغربی پاکستان میں شامل ہونے کے معاہدے پر دستخط کرا لیے تو ریاست کی عوام اس جبری شمولیت پر باقی چھوٹی قوموں کی طرح مخالفت کرنے لگے۔ کیونکہ لوگ کو نواب صاحب سے ہر گز یہ توقع نہیں تھی کہ سابقہ وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کا قدیم ثقافتوں اور زبانوں کا مذاق اڑانے والے بیان کے بعد بھی نواب

صاحب ون یونٹ میں شامل ہو جائیں گے۔ بہاول پور کے ریاست کی عوام کی تاریخ، تہذیب، ثقافت، زبان اور خود مختیاری کا مول 32 لاکھ روپے لگایا گیا تو نواب یہ سب اپنی جیب میں ڈال کر پھر سے والایت روانہ ہو گئے۔ نواب صاحب کے اس عمل سے فیاض جیسے کئی قوم پرست اپنی اور ریاست کی شناخت کی خاطر میدان میں اترے تھے۔

30 ستمبر 1955ء کو اس معاہدے کے مطابق پاکستان کی آئین ساز اسمبلی نے ویسٹ پاکستان ایکٹ منظور کر لیا جس کا اطلاق چودہ اکتوبر سے ہونا تھا۔ ڈیرہ نواب اور احمد پور کی عوام پر یہ 14 دن بہت گراں گزرے تھے۔ کیونکہ قوم پرستوں نے احتجاع، ہڑتال اور جلسے جلوس سے شروع کر دے تھے۔ ڈیرہ نواب صرف ہڑتال تک معاملہ رہ تھا مگر احمد پور میں ہڑتال کے ساتھ جلسے جلوسوں نے شہریوں کی زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ اس دوران ون یونٹ کے رد عمل میں "انٹی ون یونٹ فرنٹ" کے نام کی ایک تحریک صوبہ سرحد سے چلی، جس کے بانی عبدالغفار خان تھے۔ اس تحریک کا ان علاقوں میں زیادہ زور شور تھا جو ون یونٹ کی وجہ سے اپنی لسانی اور ثقافتی شناخت گم کر بیٹھے تھے۔ یہ تحریک قومی اور لسانی عصبیت کی بنیاد پر وجود میں آئی۔ اس تحریک کا مقصد ون یونٹ کا خاتمہ اور اس کے بعد مثاترہ کی بحالی تھا مگر کچھ اس طرح کہ ریاستوں کی سابقہ پہچان سے الگ کوئی اور شکل لیکن بہاول پور کو اس لیے استثناء حاصل تھی کہ یہ ثقافت کے ساتھ ساتھ لسانی طور پر بھی علیحدہ شناخت کا حامل تھا۔

محمد حفیظ نے اپنے ناول کے مرکزی کردار فیاض کے ذریعے سے جہاں مذہبی تعصب و امتیاز کی تصویر کھینچی ہے وہیں پہ ون یونٹ سے پیدا ہونے والے قومی تعصب میں مبتلا فیاض جیسے کئی افراد کا ذکر کیا ہے جو اس وقت قوم پرستی میں پیش پیش تھے۔ فیاض کو اینٹی ون یونٹ فرنٹ کی تحریک میں اپنی اور ریاست کی گمشدہ پہچان کی جھلک دکھائی دینے کی امید دکھائی دی تو وہ اس تحریک کا ورکر بن جاتا ہے۔ فیاض ون یونٹ اور نواب صاحب کے خلاف گلی گلی محلے محلے نعرے لگاتا ہے۔ فیاض اب حکمت کم اور انقلابی تقریریں زیادہ کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ ریاست بہاول پور کی گمشدہ پہچان کو بحال کرانے کے لیے جس طرح مقدمہ لڑتا ہے اس کے بارے میں خورشید ربانی اپنی کتاب "محمد حفیظ خان: شخصیت اور فن" میں لکھتے ہیں

> "فیاض کا کردار بہاول پور کا مقدمہ بہت خوب صورتی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ایک ایسے وقت جب بہاول پور کے نواب بے بس ہو کر دور دیس جا بیٹھے تھے، فیاض جیسے لوگ اپنی جان ہتھیلی پر لے کر ریاست کی شناخت کا مقدمہ قانونی طور پر بھی لڑ رہے تھے اور سیاسی طور پر بھی۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ طاقتور طبقے اپنے مفادات کے لیے فیصلے کرتے وقت عوام کو تختہ مشق بناتے ہیں۔ اپنی رعایا کا خون چوستے ہیں اور دھرتی سے بے وفائی کرتے ہیں۔

لیکن غریب، اپنی دھرتی سے، عوام سے اور اپنی مٹی سے وفاداری کا نہ صرف دم بھرتے ہیں بلکہ وقت پڑنے پر اپنی جان کا نذرانہ دے کر مٹی کا قرض ادا کرتے ہیں۔"[9]

اینٹی ون یونٹ فرنٹ (یہ تحریک قومی اور لسانی عصبیت کی بنیاد پر وجود میں آئی تھی) کی بڑی قیادت نے ایک نیا مطالبہ کر دیا کہ ون یونٹ کے خاتمے کے بعد مغربی پاکستان کے چار نہیں پانچ صوبے بنائے جائیں سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد کے ساتھ ساتھ بہاول پور کو بھی صوبے کی حیثیت دی جائے۔ اسی کے باعث فرنٹ کے مرکزی قائدین عبدالصمد خان اچکزئی اور عبدالغفار خان کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر دیا جاتا ہے۔ فیاض کو معلوم ہوا کہ عبدالصمد خان اچکزئی کی پیروی بہاول پور میں ایک وکیل ریاض ہاشمی (جو ایک قوم پرست) کر رہا ہے تو فیاض ہفتے میں ایک ضرور وکیل صاحب کے ڈیرے پر جاتا ہے۔ وہاں سے جو جو خبرین سنتا ہے ان خبروں کو پھر ڈیرہ نواب کے بازار میں اپنے مطب پہ بیٹھ کر لوگوں کو سناتا ہے۔ فیاض اپنے مطب کو اینٹی ون یونٹ فرنٹ کا دفتر بنا دیتا ہے اور مطب کے بار فرنٹ کا بورڈ بھی لگا دیتا ہے۔ اب مریضوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا بھی رش زیادہ ہوتا ہے جو اس جیسے قوم پرست ہوتے ہیں۔ اس وقت ریاست کے سبھی نوجون یہی چاہتے تھے کہ بہاول پور پاکستان کا صوبہ بنے جہاں وہ اپنی ثقافتی، تہذیبی اور لسانی پہچان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

"فیاض اپنے مطب کے باہر "اینٹی ون یونٹ فرنٹ" کے دفتر کا بورڈ لگایا اور آنے جانے والوں کے ساتھ وہ سبھی باتیں سانجھی کرنی شروع کر دیں کہ جو وہ ہر ہفتے ریاض ہاشمی وکیل کے ڈیرے سے سن کر آیا کرتا تھا۔ بہت ہی جلد اس نے ڈیرے کے بازار کے دکانداروں سمیت کچھ نوجوانوں کا ایسا گروتیار کر لیا جو نہ صرف اس کی بات سنا کرتے تھے بلکہ اس سے سن کر آگے بھی بڑھاتے تھے۔ یہ گروپ بننے کے بعد فیاض کی حیثیت ایک چھوٹے موٹے قوم پرست سیاسی لیڈر کی ہو گئی کہ جسے ریاض ہاشمی وکیل کے علاوہ احمد پور اور ڈیرہ نواب میں کام کرنے والی دیگر سیاسی پارٹیوں کے مقامی رہنما بھی توجہ سے دیکھنے اور سننے لگ گئے تھے۔"[10]

حکومت نے اینٹی ون یونٹ فرنٹ کے خلاف ایکشن لیا تو جہاں کہیں قوم پرستوں کا ٹھکانہ تھا وہاں چھاپے مار کر مقامی قیادت کے ساتھ ورکروں کو بھی گرفتار کر لیا۔ جب کہ ڈیرہ نواب کے بازار سے فیاض کو بھی بھینس چوری کا الزم لگا کر گرفتار کیا گیا اور کسی عدالت میں پیش کے بغیر جیل میں ڈال دیا۔ فیاض لاوارث ہونے کی وجہ سے جس جرم کی سزا چند مہینوں تھی اس میں بغیر سماعت کے دس سال گزر گئے۔ دس سال بعد 1966ء کو فیاض کی جیل سے رہائی اس صورت میں ہوئی۔ جب گورنر مغربی پاکستان کے حکم پر مجسٹریٹ صاحب قیدیوں کے مسائل سننے اور معمولی جرائم

میں گرفتار قیدیوں کی فوراضمانت کرنے کے لیے جیل میں آئے تھے۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس دن فیاض کو بھی جیل کی چاردیواری سے آزاد کر دیا تھا۔

بیگم سلمیٰ جو مجسٹریٹ کے ساتھ جیل میں آئی تھی۔ بیگم سلمیٰ ایک سماجی وسیاسی خاتون تھیں اور وہ ایک فلاحی تنظیم "سماج سیوا" کے نام سے چلا رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے فیاض کو جیل کی رہائی کے بعد اپنے ساتھ گھر لیے گئی تھی۔ فیاض بیگم سلمیٰ کے گھر پر ہی ہوتا ہے کہ نواب آف بہاول پور صادق خان عباسی کا انتقال ہو جاتا ہے اور اس کی میت کو واپس بہاول پور لیے آتے ہیں۔ فیاض نواب صاحب کے جنازمیں شریک ہوتا ہے اور وہاں پر کہتا ہے کہ

"دولہا سئیں آپ کو ریاستیوں سے کئے گئے سبھی مظالم معاف مگر ون یونٹ کا گناہ تو یہاں کی دھرتی بھی معاف نہیں کر سکتی۔"[11]

فیاض کی اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بہاول پور کی عوام نواب صاحب سے کس قدر خفا تھی۔ کیونکہ نواب صاحب وجہ سے ان کی اپنی علاقی اور لسانی شناخت چھینی گئی تھی۔ جس کو دوبارا حاصل کرنے کے لیے وہ دردر کی خاک چھن رہے تھے اور ہر قسم کے مظالم کا سامنہ کر رہے تھے۔ یہ سب نواب صاحب کا ہی کیا ہوا تھا کہ ریاست کی عوام کی علاقی اور لسانی شناحت ختم ہو کے رہ گئی تھی۔

1968ء کے آغاز میں مشرقی پاکستان کے سیاسی لیڈر عوامی لیک کے شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنے چونتیس ساتھیوں سمیٹ وطن سے غداری کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر "اگرتلہ سازش کیس" چل دیا گیا اور بنگالیوں کو کہا گیا کہ جو بھی ون یونٹ کی مخالفت کرگا اس کو عبرت کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اس کیس کی سماعت نے مشرقی پاکستان کے ساتھ مغربی پاکستان کی سبھی لسانی ثقافتوں کو ڈرانے کی بجائے اپنا طریقہ کار بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت کے بہت سارے قوم پرستوں نے چوری چھپے ون یونٹ کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ اسی دران فیاض کے کچھ ناننے والے اس کو تلاش کرتے ہوئے اس کے پاس آئے اور فیاض کو ایک نئی تحریک بنانے کا کہا مگر فیاض نے صاف انکار کر دیا۔ فیاض کا جواب سنتے ہی وہ لوگ ناکام لوٹ گے مگر چند دن بعد فیاض خود ہی ان دوستوں کو تلاش کرنے کے لیے نکل پڑا۔ جب احمد پور میں سکول کے لڑکوں اور وکلاء نے جنرل ایوب خان کے خلاف جلوس نکالا تو پولیس نے ان پہ لاٹھی چارج کیا۔ اس لاٹھی چارج کی زد میں سکول کے کئی لڑکوں کے علاوہ راہگیر بھی آئے۔ ان راہگیروں میں ایک فیاض بھی تھا جس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ فیاض نے یہ سب دیکھ کر سوچا کہ کیا ہم نسل در نسل ایسے ظلم وستم کا نشانہ بنتے رہیں۔ اس سے فیاض کو قومی اور لسانی تحرک ملتا ہے جس کی وجہ وہ پھر ایک تحریک بنانے کے لیے نکل پڑا۔

"کچھ دنوں کے بعد کلائی کی ہڈی تو جڑ گئی مگر فیاض کا کرچی کرچی ہوا دل کہیں سے بھی نہ جڑ سکا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے بعد کی نسل کو ریاستی جبر اور تشدد کا شکار ہوتے دیکھا ہوا تھا اور وہ بھی کسی بغاوت یا احتجاج کا حصہ بنے بغیر۔ کیا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا نسل در نسل۔ کیا کبھی اس کا بھی انت ہوگا۔ فیاض کو ان سوالوں کے جواب میں سکوت اور مایوسی ملی تو اس نے ان سبھی دوستوں کو تلاشنا شروع کر دیا جو اسے نئی تنظیم سازی کا حصہ بنانے کے لیے آتے رہے تھے۔"[12]

اس وقت صدر ایوب کے خلاف مشرقی اور مغربی پاکستان کی عوام اٹھ کھڑی تھی۔ جن میں ذوالفقار علی بھٹو کی تحریک علانِ تاشقند کے خلاف جد جہد اور روزمرہ کے سامانِ خورد و نوش کی اشیاء کی مہنگائی کے حوالے سے پر تشدد احتجاجی جلسے اور جلوس نمایاں تھے۔ اور اس کے علاوہ ون یونٹ کی تحریک نئے نئے بھیس بدل کر الگ سے احتجاج و جلوس نکال رہی تھی۔ ایوب خان نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو خود حکومت کو خدا حافظ کہہ کر چلتا بنا۔ اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اسپیکر قومی اسمبلی حکومت سنبھالتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک بار پھر ملک مارشل لاء کی نذر ہو گیا۔ اس بار جنرل یحیٰ نے حکومت سنبھال لی۔

"مارشل لاء لگا تو فیاض کئی دن تک پھر سے احمد پور کی غلہ منڈی میں پٹھان چوکیدار کے چوبارے میں چھپا رہا۔ پٹھان نے خیر خیریت جاننے کی بہت کوشش کی کہ وہ اچھی بھلی دکان کو تالا لگا کر اس چھوٹے سے چوبارے میں کیوں گھسڑا ہوا ہے مگر فیاض اسے ٹالتا رہا کہ کسی ان دیکھے دشمن سے واسطہ پڑا گیا، اب کرے بھی تو کیا کرے۔ پولیس اس کے سمیت سبھی اینٹی ون یونٹ قوم پرستوں کے ٹھکانوں رچھاپے مارتی پھر رہی تھی۔ ادھر ان سب کا یہی فیصلہ کہ اس بار گرفت میں نہیں آنا، انڈر گراؤنڈ رہنا ہے اور تحریک کو مرنے نہیں دینا۔"[13]

مارچ 1970ء کو جنرل یحیٰ خان نے لیگل فریم ورک آرڈر کی رو سے جنرل ایوب خان کے جمہوری نظام کو ختم کر کے تین سو ممبروں کی قومی اسمبلی بنانے کا قانون نافذ کیا تو بہاول پور کے ریاستی ون یونٹ ٹوٹنے پر خوش تو تھے مگر ان کے ساتھ اس بار بھی دھوکا ہو گیا۔ ون یونٹ تو ضرور ٹوٹا مگر بہاول پور کو صوبہ پھر بھی نا بنایا گیا۔ مغربی پاکستان کے چار صوبے بنائے گئے سندھ، پنجاب، خیبر پختون خوہ اور بلوچستان کو صوبہ کا درجہ دیا گیا۔ بہاول پور کو صوبہ پنجاب میں ضم کر دیا گیا اور ایک بار پھر ریاستی اپنی شناخت کی خاطر روتے پیٹتے رہے۔ ون یونٹ ٹوٹنے سے قبل تو پشتون، بلوچ، سندھی، بنگالی اور براہوی یہ سب بہاول پور کی عوام کے دکھ میں برابر کے شریک تھے لیکن جب ون یونٹ ٹوٹا اور

بہاول پور کو صوبہ پنجاب میں شامل کر دیا گیا تو بہاول پور کے لوگوں کا کوئی ہمدرد نہ رہا۔ ریاست بہاول پور کی عوام کو اپنی علاقی اور لسانی شناخت کی جنگ اکیلے ہی لڑنی پڑ گئی۔ اس وقت ریاست کی عوام کا مسئلہ صرف اور صرف قیادت کا تھا۔

"ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد ریاست کے قوم پرستوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اگر کوئی تھا تو صرف قیادت کا تھا۔ نواب صادق محمد خان کے بعد اگرچہ ولی عہد محمد عباسی نے امیر آف بہاول پور کا لقب اختیار کرتے ہوئے علامتی نوابی سنبھال لی تھی مگر سرکاری طور پر ان کی حیثیت ایک وظیفہ خوار سے زیادہ نہیں تھی۔ اس پر بھی سوا یہ کہ عوامی سطح پر نہ تو کسی سے ان کا کوئی میل ملاپ اور نہ ہی کوئی سنگ سنجوک۔ بے اعتمادی کی وسیع تر ہوتی ہوئی خلیج ایک جانب اور دوسری طرف نامعلوم خوف کا شکار یہ علامتی قیادت اپنی سابقہ رعیت کو کوئی روشن راہ دکھانے سے بھی قاصر لیکن اس کے باوجود فیاض کی نسل کے لوگ ابھی تک نواب صاحب کو اپنا حاکم سمجھتے اور صادق گڑھ پیلس کا در کھلنے کے منتظر رہتے تھے۔"[14]

بہاول پور کی عوام کسی ایک قائد کے نہ ہونے کی وجہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئی لیکن ان کا مقصد ایک ہی تھا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ بہاول پور کی علاقی اور لسانی شناخت کی بحالی کی خاطر جدوجہد کرتے رہے۔

"ریاستیوں کا یہ اکٹھ اتنی بڑی پر جوش تحریک بن کر سامنے آیا کہ ایک بار تو پوری حکومتی مشینری ہل کر رہ گئی۔ روزانہ کے جلوس، جلسے اور اخباری بیانات نے ماحول کو اس طرح گرمایا کہ یوں لگتا تھا صوبہ بہاول پور کل کی بجائے آج ہی بن کے رہے گا۔ فیاض کی حکمت کی دکان کو ایک بار پھر تالہ لگ گیا اور وہ اپنا سب کچھ بیچ باچ کر بہاول پور منتقل ہو گیا۔ اب چوک فوارے کے نزدیک احمد پوری دروازے کے اندر ایک چھوٹا سا چوبارہ اس کا نیا مسکن تھا جب کہ حکمت کے لیے جگہ تو اب صوبہ بننے کے بعد تلاش کرنا تھی۔ فیاض کی صبح اگر ماڈل ٹاؤن اے میں میاں نظام دین حیدر کی کوٹھی پر ہوتی تو دوپہر ریاض ہاشمی وکیل کے دفتر میں۔ دن ڈھلتا اگر شہزادہ سئیں کے ہاں تو عشاء سیٹھ عبید الرحمٰن کی کوٹھی کے احاطے میں اس دوران جہاں جلسہ وہاں فیاض موجود اور جہاں جلوس وہاں فیاض سب سے آگے۔"[15]

وادھو:

ناول میں ایک ایسا کردار ہے جو متشدد ذہن کا مالک ہے۔اس کا تعلق مسلم مذہب سے ہوتا ہے اور اس کی ڈیرہ نواب کے بازار میں حکیم رام لعل کے مطب کے سامنے کریانے کی دکان ہوتی ہے۔جب دن میں اسے اپنے گاہکوں سے فرصت ملتی ہے تو وہ اپنے قریبی دھوبی "دھچر" کے پاس آبیٹھتا ہے۔دھچر بھی مسلمان ہوتا ہے اس لیے وادھو کی اس کے ساتھ بڑی گہری دوستی ہوتی ہے۔جب یہ دونوں مل بیٹھتے ہیں تو ان کی گفتگو سیاسی حوالے یہ ہوتی ہے کہ ریاست بہاول پور تقسیم کے بعد بھارت کے ساتھ رہے گی یا پاکستان کا حصہ بن جائے گی۔وادھو، دھچر سے جب یہی سوال پوچھتا تو دھچر آگے سے یہی کہتا کہ ریاست کا فیصلہ نواب صاحب نے کرنا ہے اور ریاست بھارت کے ساتھ ہو جائے یا پاکستان کے ساتھ، تو نے یہی لونی تیلی کی دکان چلانی ہے اور میں لوگوں کے کپڑے دھونے و استری کرتے رہنا ہے۔وادھو حکیم رام لعل کے مطب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ریاست پاکستان کے ساتھ ہوئی تو اس کراڑ کی یہ دکان میرے حصے میں آئے گی۔دھچر وادھو کی طرح مذہبی تعصب میں مبتلا نہیں ہوتا ہے۔اس لیے وہ وادھو کو کہتا ہے کہ حکیم کراڑ ہے تو کیا ہوا وہ ہمارے سارے علاقے کے لوگوں کا دوادارو تو کر رہا ہے۔

ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ شام سے ذرا پہلے وادھو دکان بند کر کے دھچر کی دکان کے پھٹے پر آبیٹھتا ہے۔دھچر اور وادھو اپنی باتوں میں لگے ہوئے ہوتے ہیں کہ بارش شروع ہو جاتی ہے۔دھچر بارش کو دیکھ کر وادھو پہ غصے ہوتا کہ مجھے کیسی فضول باتوں میں تو نے لگا دیا ہے۔میں نے آج گھر جلدی جانا تھا کیونکہ میری بچی کو بخار تھا اور اب تیری بھابھی غصہ ہو رہی ہو گی۔آگے سے وادھو کہتا ہے یار یہ عورتیں کبھی راضی نہیں ہوتی ہیں۔دھچر کہنے لگتا ہے کہ یار تیری بھی کوئی اولاد ہوتی تو تو بھی میری طرح گھر جانے کے لیے پریشان ہو رہا ہوتا۔وادھو دھچر کی اس بات پر جواب دیتا ہے کہ میری بھی عورت بھی تیری عورت کی طرح ہوتی اور مجھے بھی اولاد جیسا سکھ دیتی۔دھچر نے وادھو کو پھر کہا کہ تو اس حکیم کو ایک بار اپنا ہاتھ دکھا کر دوا لے شاہد کوئی اولاد ہو جائے۔

> ""یار کئی بار تجھے کہا ہے کہ حکیم رام لعل کو تو دکھاؤ کئی بے اولادوں کی اولاد ہو گی ہے۔پر تو نے جیسے قسم اٹھائی ہوئی ہے نہ دکھانے کی'۔دھچر موقع دیکھ کر پھر سے شروع ہو گیا۔
>
> 'میں او ترک تو مر جاؤں گا مگر اس کراڑ کو ہاتھ نہیں دکھاؤں گا'۔وادھو تپ کر کھڑا ہو گیا۔"[16]

یہاں پر ہمیں وادھو کا متعصب پن نظر آتا ہے۔وہ ایک حکیم سے صرف اس لیے نفرت کرتا ہے کہ وہ کسی دوسرے مذہب کا ماننے والا ہے۔وادھو مذہبی حوالے سے اس قدر تعصبی ہوتا ہے کہ وہ اپنا علاج (دوادارو) ایک ہندو حکیم سے کروانا اپنی توہین سمجھتا ہے۔مگر یہی وادھو ہی ہوتا ہے جو تقسیم کا سن کر اس خیال میں کھویا ہوا ہوتا ہے کہ تقسیم

کے بعد ریاست پاکستان کے ساتھ ملے اور میں اس کراڑ (ہندو) حکیم کو مار کر اس کی دکان کا مالک بن جاؤں گا۔ یعنی کہ ہندو حکیم کی دوا کھانے سے اس کے ایمان چلے جانے کا خطرہ تھا لیکن اسی ہندو حکیم کی دکان کو اپنی مالکیت میں لینے سے اس کے نہ ایمان کو خطرہ تھا اور نہ وہ دکان حرام لگتی تھی۔ جب تقسیم کے بعد ریاست کے نواب نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا تو پہلی ہی شب کو وادھو چند لوگوں کے ساتھ مل کر حکیم رام لعل کے مطب پر چڑھائی کر دیتا ہے۔ جیسے ہی وادھو حکیم صاحب کے دکان کو آگ لگنا چاہتا ہے تو اندر سے فیاض دروازہ کھلتا ہے اور کہتا ہے کہ حکیم صاحب یہاں پر نہیں ہے۔ اس سارے واقعے کو ناول میں اس طرح پیش کیا ہے۔

> "ابھی آگ نے لکڑیوں کو پکڑ ہی نہیں تھا کہ ایکدم دروازہ اندر سے کھلا اور ایک بل دی ہوئی گھنی مونچھوں والا بھاری بھر کم ٹٹین باوردی پلسیا دروازہ روک کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ پستول کا رخ فسادیوں کی طرف تھا۔ اس کے عقب میں تین بندوق بردار پولیس کے سپاہی کسی دیوار کی اینٹوں کی مانند آپس میں جڑ کر کھڑے تھے۔ فسادیوں کا جتھا جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ پٹھی ہوئی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ یہ سب کچھ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ مگر پھر بھی حوصلہ کرنے کے بعد ان کا پردھان آگے بڑھا اور کھڑکا کر بولا کہ اسلحہ تو ان کے پاس بھی ہے مگر زیب نہیں دیتا کہ وہ پولیس والوں رہا تھ اٹھائیں، اس لیے شرافت اسی میں ہے کہ طرف ہو کر حکیم اور اس کے گھر والوں کو ان کے حوالے کر کے دکان خالی کر دی جائے۔"[17]

مذہبی تعصب کی یہ صورت حال ہمارے پورے سماج کی نمائندہ ہے۔ وادھو ہمارے سماج میں مذہبی اونچ نیچ ، بلندی اور پستی کا استعارہ ہے۔ وادھو کے پس منظر میں ہر طرح کا مذہبی تعصب نشان زد ہوتا نظر آتا ہے اور اس طرح کی مثالوں سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ تقسیمِ برصغیر کے بعد لکھے گئے ادب میں ایسے مثالوں کو واضح کیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے ایک طرف مذہبی تعصب کے زیر اثر ہندوؤں سے اس قدر نفرت کی کہ ان کے ہاتھ کا بنا کھانا نہ کھایا۔ پانی تک نہ پیا۔ یہی حال ہندوؤں کا بھی تھا کہ اس زمانے میں ریلوے اسٹیشنوں پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے الگ الگ پانی رکھا ہوتا تھا۔ اس سب کے باوجود جب تقسیم کا عمل شروع ہوا تو وہ لوٹ مار ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ مال و دولت کے ساتھ عزتیں بھی لوٹیں گئیں اور یہ نہ دیکھا گیا کہ کون مسلم ہے اور کون ہندو۔ مذہبی تعصب جس قدر بھی تھا، اس نے ہوس کے آگے ٹھہرنا گوارا نہ کیا

محمد حفیظ کا یہ ناول وطنِ عزیز میں موجود اشرافیہ کی سیاہ کاریوں کی روداد بیان کرتا ہے۔اس ناول میں سیاسی، سماجی معاشی اور معاشرتی وجوہات اور اثرات کا عکس پیش کیا گیا ہے۔ ناول کے نام سے ہی کہانی پوری طرح ذہن کی سطح پر اتر آتی ہے۔ "کرک ناتھ" ایک سیاہ رنگ کا مرغ ہوتا ہے جس کا خون، ماس اور ہڈیاں تک سیاہ ہی ہوتی ہیں۔اس لیے ہمارے سماج میں موجودہ سیاہ چہروں کو پیش کرنے کے لیے ناول کا نام ہی کافی ہے۔ یہ ناول موجوہ عہد کے سیاہ ترین المیوں کا عکاس ہے۔اس ناول کے کردار از خود وجود میں نہیں آتے بلکہ انھیں سماج کا ظالم اور مفاد پرست طبقہ تخلیق کرتا ہے اور اپنے مفاد کے لیے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتا ہے۔اس کی کہانی میں اشرافیہ کی پاور پلے، جنسی تشدد، قیدیوں سے امتیازی سلوک، سوشل میڈیا کے ذریعے خواتین کی عزتوں سے کھواڑ سمیت کئی جگر سوز واقعات کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ طاقت ور طبقے کے حصول کے لیے استعمال ہونے والے ہر طرح کے سیاہ ترین ہتھکنڈوں کا استعمال دیکھایا گیا ہے۔ کرک ناتھ ہمارے سماج کا آئینہ ہے، جس میں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے منفی استعمال نے ہماری نوجوان نسل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، جس کی وجہ سے جنسی بے راہ روی سمیت کئی امراض ہمارے سماج میں جنم لے رہے ہیں۔ ناول پوری زندگی کی عکاسی کرتا ہے اس لیے محمد حفیظ نے صرف ایک پہلو پر نہیں بلکہ زندگی کے ہر ایک پہلو سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔اس کہانی میں ہم جنس پرستی، بد عملی، قیدیوں کے ساتھ امتیازی سلوک، سماجی ناانصافی اور پولیس گردی جیسے کئی مظالم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول نگار فرضی کرداروں کے ذریعے ہمارے ملک میں ہونے والے ہر مظالم اور سماجی ناانصافی کو خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔

ناول کا آغاز زفیرہ احمد اور مبشر رضا کے کرداروں سے ہوتا ہے۔ زفیرہ احمد اس ناول کا ایک اہم کردار ہے جو ایک بڑے بزنس مین کی بیٹی ہوتی ہے۔ زفیرہ احمد والد کی وفات کے بعد کمپنی کی چیف ایگزیکیٹو بن جاتی ہے اور اپنی پیشہ وارنہ تعلیم کی وجہ سے کمپنی کو آسمان کی بلندوں تک لے جاتی ہے۔ زفیرہ احمد کے حسن کی وجہ سے اس سے بڑے صاحب جیسے کئی افسران خلوت کا تقاضا کرتے مگر وہ سب کو ٹال دیتی ہے۔ کیونکہ اس کی فطرت میں مرد سے بیزاری موجود ہے اور وہ مرد کی بجائے اپنے کتے کو خلوتوں کا دوست بناتی ہے۔اشرافیہ جیسے طبقے سے تعلق ہونے کی وجہ سے زفیرہ احمد بھی جانوروں کے ساتھ جنسی لطف کشید کرنے کی بیماری میں مبتلا ہوتی ہے۔

زفیرہ احمد اپنے شونی (کتے) کے ساتھ جنسی تعلقات وطنِ عزیز کے طبقہ اشرافی میں جنسی آزادی کی بدترین مثال ہے۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس کلاس یعنی طبقے میں مرد، عورت کو بطور ایک جنس یا ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے وہاں کی عورت پھر مردوں کو کتا اور کتوں کو مرد کا مقام دے دیتی ہیں۔

> "اس روز بھی وہ اپنے فارم ہاؤس میں انتہائی تنے ہوئے اعصاب اور دہکتے ہوئے طیش کے عالم میں پہنچی تھی۔اسے دیکھتے ہی شونی دوڑا ہوا آیا اور اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ زفیرہ

نے خلاف معمول اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر لپٹانے کی بجائے محض جھک کر اس کی گردن اور کمر پر ہاتھ پھیرا اور انتہائی بے تابی سے سیدھی اپنے لائبریری روم کے ایک کونے میں بنی ہوئی بار کے پاس پہنچی اور بلیک لیبل کا ایک ڈبل پیک بنا کر برف ڈالے بغیر ایک لمبا سا گھونٹ اس طرح لیا کہ اس کا حلق محسوس کیے جانے کی گہرائی تک خوشگوار تلخی سے سیراب ہوتا چلا گیا۔ وہسکی کا اگلا گھونٹ لینے تک وہ اچھی بھلی پر سکون ہو چکی تھی۔ شونی بھی دبے قدموں کمرے میں آیا اور چوبی فرش پر بیٹھ کر زفیرہ کی طرف استفساریہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ زفیرہ نے اس کی آنکھوں کا پیغام پڑھ لیا اور مسکرا دی۔ شونی ایک دم اٹھا اور محبت آمیز بے تکلفی سے اس کے قریب جا کر اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ "یہ مرد ایسے کیوں نہیں ہوتے؟" شونی کی لجاجت بھری محبت دیکھ کر اس کے ذہن میں مبشر رضا کا چہرہ ابھر آیا۔"[18]

مبشر رضا زفیرہ احمد کی کمپنی میں کاپی رائٹر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہی زفیرہ احمد کی کمپنی بام عروج تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ اچانک ایک دن مبشر رضا کہیں گم ہو جاتا ہے اور کئی دن گزر جاتے ہیں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔ زفیرہ احمد کاروبار کو نقصان کی طرف جاتا دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے اور اپنے کاروبار کو بچانے کے لیے بڑے صاحب سے مدد لینے کا سوچتی ہے۔ جب زفیرہ احمد بڑے صاحب کو فون کر کے مبشر رضا کے متبادل تلاش کرنے کا کہتی ہے تو پہلے سے ہی زفیرہ احمد کے وصال سے محرومی کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔ وہ زفیرہ احمد کو لالچ دیتا ہے کہ آپ کو دوسری کمپنی کا کاپی رائٹ توڑ کر دوں گا مگر اس شرط پر کہ ایک تو مجھے کمپنی کے اکیاون فیصد کا شیئر کا حصہ دار بناؤ اور دوسرا کل شام میری فارم ہاؤس پر آ کر میرے بستر پر ایک رات گزارو۔ زفیرہ احمد غصہ کر کے فون بند کر دیتی ہے۔ لیکن دوسرے دن کاروبار کے نقصان کی فکر اس کو پھر سے بڑے صاحب کو فون کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ بڑے صاحب کو فون پر کہتی ہے کہ مجھے ایک شرط منظور ہے میں کل شام کو آپ کے فارم ہاؤس پر پہنچ جاؤں گی اور دوسری بات اکیاؤن فیصد شیئر کی وہ میں آپ کو نہیں دے سکتی ہوں۔ بڑا صاحب زفیرہ احمد کو اپنے فارم ہاؤس پر آنے کا وقت بتا دیتا ہے۔ جیسے ہی زفیرہ احمد بڑے صاحب کے فارم ہاؤس پہنچتی ہے تو بڑا صاحب اکیاؤن فیصد شیئر نا ملنے کے غصے میں اس سے اس طرح انتقام لیتا ہے کہ زفیرہ احمد کاروبار کو بچانے کے ساتھ ساتھ اپنی عزت بھی خاک میں میلا بیٹھتی ہے۔ بڑا صاحب زفیرہ احمد کی سیکس وڈیو بنا کر ان کو انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر شیئر کر دیتا ہے۔ اس واقع سے زفیرہ احمد کے حریفوں کو مزید موقع مل جاتا ہے اس کو ذلیل کرنے کا۔

اس طرح زفیرہ احمد معاشی تعصب کا نشانہ بنتی ہے اور دوسرا صنفی امتیاز کا بھی۔ معاشی تعصب کا اس لیے کہ اس کی کمپنی ملک کی سب بڑی کمپنی تھی تو بڑا صاحب اس کمپنی کا حصہ دار بنا چاہتا تھا اور دوسرے مخالفین زفیرہ احمد کی شہرت دیکھا کر اس کی کمپنی کو نقصان پہنچانے کے لیے کوشش میں رہتے تھے۔ اب یہاں مبشر رضا کی اچانک گم شدگی اور بڑے صاحب کی طرف سے زفیرہ احمد کو بے ابرو کرنا یہ سب کچھ معاشی تعصب کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ زفیرہ احمد کی ناکامی اور بدنامی سے اس کے حریفوں کی کامیابی تھی۔ اور صنفی امتیاز اس لیے کہ ہمارے سماج میں صرف مرد کو ہی کامیاب بزنس مین سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کہ ہمارے سماج کے اندار عورت کو کاروبار کرنے نہیں دیا جاتا اور اگر وہ کاروبار کرتی ہے تو اس کی راہ میں مرد رکاوٹ بنتے ہیں یعنی اس کی عزت پر حملہ آور ہو کر اس کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے اس ناول میں زفیرہ احمد کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے ہمیں ایک کردار کے ذریعے اہم سماجی برایاں دیکھانے کی کوشش کی ہے۔ کتوں سے رغبت کا سبب بھی مرد کا سماجی جبر بنتا ہے کہ وہ عورت کو کھلونا سمجھ کر اس کے جذبات و احساسات کو سمجھتے ہیں نہ سمجھنا چاہتے ہیں۔

ماہین کا کردار:

ماہین نامی لڑکی بھی اس ناول کا ایک کردار ہے جس کا مہذب گھرانے سے تعلق ہوتا ہے۔ ماہین ایم فل کمیسٹری کی اسوڈینٹ ہوتی ہے اور وہ مذہبی ماحول کی وجہ سے یونیوسٹی میں خود کو سر سے پاؤں تک ڈھک کر رکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے اسکے کلاس فیلوز اس کا مزاق اڑاتے ہیں اور غلط قسم کے جملے بکتے ہیں۔ ماہین کو رات کے وقت یونیوسٹی کے لڑکوں کے وہ جملے یاد آتے ہیں اور اس کے بدن میں بے قراری پیدا ہونے لگتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ سوشل میڈیا پر لڑکے تلاش کر کے ان سے دوستی کرنے لگ جاتی ہے۔ سب پہلے وہ جمال احسن نامی شخص سے دوستی کرتی ہے اور اس کے ساتھ میسنجر پر بات کرتے کرتے فون کالز پر آجاتی ہے۔

> "ایک رات جمال احسن نے اسے رات کے تیسرے پہر ایک ایسے ذائقے سے آشنا کر دیا کہ جو موبائل فون کی دوسری جانب بولے ہوئے آتش صفت لفظوں سے اس کے رگ و پے میں اترتا اور پھر اسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیاں باریک سا پیستا ہوا دھیرے دھیرے اس نہج تک لے جاتا جہاں اس کا پورا جسم دھوئے ہوئے کپڑے کو مروڑنے کے سے انداز میں اپنے اندر ہی نچوڑ کر اس طرح کی لذت کشید کرتا جسے کسی نام کا دیا جانا نہ تو ممکن تھا اور نہ ہی اس کے بس میں۔"[19]

اس طرح ماہین جو بہت ہی مہذب اور شرمیلی ہوتی ہے اس کو جمال احسن جنسی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے اس مقام پر لے آتا ہے کہ ماہین خود سے سکائپ پر بے لباس ہونے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ مگر جمال احسن اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے تو ماہین اس پر غصہ ہو کر اس سے تعلق ختم کر دیتی ہے۔ جمال احسن کے بعد اسکا ایک دو ایسے لڑکوں سے واسطہ پڑتا ہے جو اسے دن رات پریشان کرتے رہتے ہیں۔ ماہین بڑی مشکل سے ان سے جان چھوڑاتی ہے اور پھر سے ایک نئے دوست کی تلاش میں لگ جاتی ہے۔ چند دن بعد ماہین کی دوستی نوید نامی لڑکے سے ہو جاتی ہے اور وہ ماہین کو لطف وانبساط کی ایسی منزل پر لیے آتا ہے کہ ماہین سکائپ کے ذریعے برہنہ صورت میں اس کے سامنے آنا شروع کر دیتی ہے۔ ماہین کی جس خواہش سے جمال احسن انکار کیا تھا نوید نے اس خواہش کو خوش دلی سے پورا کرنے کی ازجات دی۔ ماہین اپنی خواہش کے جال میں اس طرح پھنسی کہ زندگی اس کے لیے ایک بھیانک خوب بن گی۔

ماہین اپنی مرضی سے بنائی ہوئی برہنہ ڈویوز کی وجہ سے نوید کے ہاتھوں بلیک میل ہونے لگتی ہے۔ نوید ماہین کو اسلام آباد کے ہوٹل میں ملنے کا کہتا ہے تو ماہین اسے انکار کرتی ہے تو نوید ماہین کا انکار سنتے ہی اس کو سکائپ سے ریکاڈ کیا گیا ایک ویڈیو کلپ بھیج دیا۔ جس میں ماہین نیم برہنہ حالت میں خود لذتی کے عمل سے گزر رہی ہوتی ہے۔ نوید مزید دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ تو صرف نمونہ ہے اگر ملاقات کے لیے ہوٹل پر نہ آئی تو میں ایسی سب ریکاڈنگز یوٹیوب پر اپ لوڈ کر دوگا۔ اور وہ اپنی ہی غلطی کی وجہ سے مشکلات کی زد میں آجاتی ہے۔

> "ہر آنے والے دن کے ساتھ ہی نوید کا مطالبہ زور پکڑتا جارہا تھا۔ اب تو اس نے واضح طور پر کہنا شروع کر دیا کہ وہ اسے بس ایک بار ملے، اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق پھر وہ واپس چلا جائے گا کبھی نہ تعلق رکھنے کے وعدے کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ ماہین کے پاس اس کا کوئی مثبت جواب نہیں تھا اس لیے اس کے رد عمل میں نوید کا مطالبہ طیش میں بدلتا چلا گیا۔ ماہین کے لیے یہ امر بھی مسلسل تشکیک کا باعث تھا کہ اگر نوید واقعی دوبئی میں رہتا ہے تو ادھر اسلام آباد میں اتنے دنوں سے کیا کر رہا ہے؟ کیا اس نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا کہ وہ دوبئی میں رہتا ہے؟ ابھی وہ اس مخمصے سے نکل نہیں پائی کہ نوید نے ایک اور چال چلی۔ اس نے سکائپ سے ریکارڈ کیا گیا ایک ویڈیو کلپ ماہین کو بھجوادیا کہ جس میں وہ نیم برہنی حالت میں خود لذتی کے عمل سے گزر رہی تھی۔ نوید کا کہنا تھا کہ یہ تو محض نمونہ ہے۔ اب بھی اگر اس نے ملاقات نہ کی تو وہ اس قسم کی ڈھیروں ریکارڈنگز یوٹیوب پر ڈال دے گا اور پھر اس کے بعد جو ہوگا، اس کا تصور وہ خود ہی کر لے تو بہتر ہوگا۔"[20]

ماہین اس خوف سے نوید سے ملاقات کے لیے راضی ہو جاتی ہے اور اس سے ہوٹل کا پتہ معلوم کر کے گھر سے نکل آتی ہے۔ اس دن ماہین یونیوسٹی نہیں جاتی بلکہ نوید کے پاس ہوٹل پر ملنے آ جاتی ہے۔ جب ماہین ہوٹل پر نوید کے پاس پہنچتی ہے تو نوید وصال سے پہلے ہی زیادہ مقدار میں ویاگرہ لینے پر اسے ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ نوید کے مرتے ہی ہوٹل کا ملازم طیفا اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ماہین کو پہلے بے آبرو کرتا ہے پھر پولیس کو نوید کے قتل کی خبر دے کر الزام ماہین کے سر لگا دیتا ہے۔ ماہین نے گھر پہنچ کر یہ کہانی کچھ اس طرح سے بتائی کہ یونیوسٹی سے آتے ہوئے رکشا الٹ گیا، وہ رکشے سے باہر گری تو ایک موٹر سائیکل والے نے اس کی ٹانگوں پر سے گزار دی جس کی وجہ سے گوشت چتھر گیا ہے۔ یہ بات کرتے ہی ماہین اپنے کمرے میں چلی گی اور وہاں بیٹھ کر اپنے ساتھ ہونے والے جنسی تشدد کا جواز تلاش کرنے لگی۔

> "ماہین کو اپنے ذہن سے عصمت دری جیسی سماجی کالک پونچھنے کا جواز ملا تو اسے اپنے جسم سے ہونے والی کراہت کا احساس بھی ماند پڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ایک نئی تاب کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنسو خشک ہوئے تو وہ ساری امنگیں پھر سے بیدار ہونے لگیں کہ جو نارمل زندگی کے تقاضوں سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن سماج کی جکڑ بندی میں آئے ہوئے شعور کو ابھی کچھ اور تشفی نما جواز چاہیے تھے۔ "کیا کوئی ایسا مرد جو کسی عورت کی خلوت میں اگرچہ جبراً درندازی کا مرتکب ہوا ہو مگر اسے تلذذ کی ہر ممکن معراج تک پہنچانے کا اہل پایا گیا، اس مرد سے بہتر نہیں کہ جو رجوع تو عورت کی منشا سے کرے مگر اس سارے عمل کو اپنی کم ہمتی اور نااہلی سے مکدر بنا کر رکھ دے؟" ماہین نے اس سوال کا جواب ہر زاویے سے نہ صرف اپنے سے کیا بلکہ اپنے جسم، اپنے جذبات اور اپنے ذہن سے کیا لیکن ہر بار اسے، ہر چوکھٹ سے اس کا جواب اثبات میں ملا۔"[21]

جب پولیس ماہین کو گرفتار کرنے کے لیے ادھی رات کو اس کے گھر پہنچتی ہے تو ماہین کے ماں باپ اپنی سماجی تذلیل کے خوف سے پولیس والوں سے یہ بات بھی نہ پوچھ پائے کہ ان کی بیٹی کو کس جرم میں پکڑ کر لے جا رہے ہو۔ ماہین کے والدین نے وہی کیا جو ایک مڈل کلاس کے شریف لوگ کرتے ہیں جو اپنی غیرت کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ ماہین کے ولدین نے رات کی تاریکی میں اپنی بیٹی کو خاموشی کے ساتھ پولیس کے حوالے کر دیا اور پھر اس بیٹی کے لیے تھانے تک نہیں گئے۔ ہمارے سماج کے مڈل کلاس کا شریف طبقہ اپنی نام وری کی خاطر اپنے خون پر بھی رحم نہیں کرتے ہیں جیسے ماہین کے ماں باپ نے کیا کہ اپنی بیٹی کی مڑ کر خبر بھی نہیں لی۔ جب پولیس نے دیکھا کہ ماہین کے گھر سے کوئی بھی شخص اس کا والی وارث نہیں ہوا تو ماہین بے گناہ ہونے کے باوجود پولیس کے نجی ٹارچر سیل میں عزت و

عصمت گنوانے کے ساتھ بے پناہ تشدد کو برداشت کرتی رہی۔ پولیس والوں کی طرف سے جو مظالم ماہین پر ہوئے ہیں، انہیں دیکھا کر انسان کے دل ہی نہیں دماغ شدید صدمے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پولیس کے روپ میں رمضان، الیاسا، کالا ، شاداء، رستم اور ذیشان جیسے بھیڑیوں نے ماہین کی عزت و عصمت کو یوں ملیامیٹ کیا کہ وہ جذباتی اور نفسیاتی طور ایک خاتوں نہیں رہتی ہے۔ پولیس اسے اس قابل رہنے ہی نہیں دیتی کہ وہ عام شہری کی طرح زندگی گزار سکے۔ ماہین کے پس پردہ ہمیں پولیس گردی میں ایسے سیاہ کردار دیکھائے گئے ہیں جو معصوم اور بے گناہ انسانوں کی زندگیاں تباہ کرتے ہیں۔ یہاں پولیس اعلیٰ طبقے کے مجرموں کو سزادے کر انھیں سماج میں نشان عبرت بنانے کی بجائے مڈل کلاس طبقے کے بے گناہ اور معصوم لوگوں کو زبردستی سزا دینے اور مجرم بنانے میں مصروف رہتی ہے۔ یہ بھی امتیاز ہے جسے ہم کلاس یا طبقاتی امتیاز کہتے ہیں۔ جیسے ماہین کے ساتھ کیا اس کو نفسیاتی طور پر مفلوج کر دیا۔

"اس نے بہت ہی کم دنوں میں اتنے زیادہ ٹھکانے اور اتنے زیادہ مرد بدلے کہ اسے عورت کے مزج میں دخیل پردیسی پن اور عدم تحفظ کی وجوہات سمجھ میں آنے لگی تھیں۔"[22]

ماہین کا کردار ناول میں انفرادی طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن یہ حقیقت میں ہمارے پولیس سسٹم پر سوالات اٹھاتا ہے کہ جس کے جوابات کے لیے حکومت اور معاشرے کے افراد کو مل بیٹھنا پڑے گا۔ اس صورت حال میں ماں باپ کی طرف سے ہونے والی غفلت بھی سامنے آتی ہے جو اپنے بچوں کو موبائل اور انٹرنیٹ جیسی سہولت تو دیتے ہیں مگر ان سے یہ کبھی نہیں پوچھتے کہ وہ اس کا استعمال کس طرح کر رہے ہیں۔ اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے صنفی امتیار کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں پولیس والے عورت ذات کے ساتھ تھانے یا جیل میں کیسا سلوک کرتے ہیں۔ وہ ایک ماہین کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

طاقت ور طبقہ اپنی مضبوطی اور مفادات کی حفاظت کی خاطر عورت ذات کو استعمال کرتا ہے۔ عورت کو سماج میں بطور انسان ماننے سے انکار یہ بات واضح کرتا ہے کہ آج بھی ہمارا معاشرہ ویسے ہی ہے جیسے آج سے چودہ سو سال پہلے کا معاشرہ تھا۔ جس طرح اس زمانے میں لوگ اپنی بچیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفنا دیتے تھے ویسے ہی موجود عہد میں اسی ذہن کے لوگ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اپنی بیٹیوں کی عزت، عصمت اور زندگی دو پر لگا دیتے ہیں۔

اس ناول کے نسوانی کردار ماہین اور کلثوم، جو ابھرتی ہوئی جوانیاں ہیں، جذبوں اور احساسات میں تازگی و توانائی سے سر شار ہیں، اپنی سرشت اور فطرت میں معصوم اور بے گناہ ہیں، کرک ناتھ سماج کی منہ زور موجوں میں تنکوں کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ نسائی کرداروں میں زفیرہ احمد اور درخانئ کا کردار بھی ایسے ہی حالات کا شکار نظر آتا ہے مگر وہ دونوں استثنائی صورت میں اور طرح کی صورتحال کا سامنا کرتی ہیں۔

شبیر اور کاشف کا کردار:

اس ناول میں ایک اور اہم کردار دانش سعید کا ہے جس کو حالات شبیر سے شاکا اور شاکا سے دانش سعید بنا دیتے ہیں۔ بچپن کے دنوں میں جب اس کا نام شبیر ہوتا ہے۔ اس کا تعلق ایک غریب گھر سے ہوتا ہے۔ شبیر کا باپ غربت کے ہاتھوں تنگ آکر مزدوری کے لیے غیر ملک چلا جاتا ہے۔ باپ کے جانے کے بعد شبیر کی ماں ماموں زاد روشن سے جنسی تعلقات بنا لیتی ہے۔ شبیر کے باپ کی بیرون ملک سے آنے والی کمائی سے اس کی ماں دو مکان تیار کروا لیتی ہے۔ ایک اپنے لیے اور دوسرا باقی گھر والوں کے لیے (شبیر کے دادا دادی وغیرہ کے لیے)۔ وہ اپنے گھر میں ماما روشن کو ساتھ رکھتی ہے۔ جس کی وجہ شبیر اس فکر میں مبتلا رہتا ہے کہ شام کو ہم سے دور سونے والا ماما روشن رات کے وقت اس کی ماں کے ساتھ کیا کرنے آتا ہے۔ وہ سات آٹھ سال کا شبیر جس کی جب کبھی رات کو کسی پہر آنکھ بیدار ہوتی ہے تو یہ سب دیکھ کر سوچتا ہے۔

> "رات گئے اگر کوئی آنکھ کھلتی اور پھر حیرت سے کھلی ہی رہتی تو وہ ساتھ آٹھ برس کے شبیر کی ہوتی۔ وہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ شام کو الگ چارپائی بچھا کر قدرے دور سونے والا ماما روشن باقی کی رات اس کی ماں کے ساتھ کیوں سوتا ہے اور کیسی کیسی عجیب حرکتیں کرتا ہے۔"[23]

شبیر کا رات کے وقت نیند سے بیدار ہونا، ماما روشن اور اسکی ماں کی خلوت میں خلل ڈالتا ہے تو شبیر کی ماں ماما روشن سے کہتی ہے کہ افیم کی کنی خود بھی لگا لیا کر اور تھوڑی سی شبیر کو بھی دے دیا کرے تاکہ وہ رات کو نہ جاگ سکے۔ دوسرے دن ماما روشن شبیر کو افیم یہ کہہ کر کھلا دیتا ہے کہ یہ دوائی کھا لو آگے سردیاں آرہی ہیں نزلہ زکام وغیرہ نہیں لگے گا۔ شبیر کے افیم کھانے یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے روز صبح کو کافی دیر سے بیدار ہوتا ہے۔ جب شبیر نیند سے جاگتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ماں کی چارپائی ٹوٹی ہوئی ہوتی مگر ماں چہرے پر غصے کی جگہ آج خوشی ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ چھوٹے سے نقصان پر سارے گھر کو سر پر اٹھانے والی ماں آج اتنے بڑے نقصان پر خوش کیوں ہے؟۔ شبیر زیادہ دیر سونے کی وجہ سکول بھی دیر سے پہنچتا ہے تو وہاں ماسٹر صاحب سے مار پڑتی ہے۔ اس طرح کچھ روز ایسے ہی ماما روشن شام ہوتے ہی شبیر کو افیم کھلا دیتا ہے اور شبیر صبح کو کافی دیر تک سویا رہتا ہے۔ شبیر کو یہ بات بھی فکر مند کرنے لگتی ہے کہ وہ تو صبح کو جلدی اٹھنے والا تھا یہ کیا ہو گیا روز نہ اتنی دیر تک کیوں سویا رہتا ہوں۔ کہیں یہ ماما روشن کی دوائی کی وجہ تو نہیں ہے۔ یہ سوچا کر ایک دن وہ ماما روشن سے افیم لیے کر کھاتا نہیں ہے اور پھر رات کو اپنی ماں اور ماما روشن کو بغیر لباس کے دیکھا کر حران ہو جاتا ہے۔ ماں اور ماما روشن کی رات بھر کی برہنہ حرکتیں سات آٹھ سال کے شبیر کے ذہن میں بہت سے

سوالات پیدا کرتی ہیں۔ شبیر صبح کو نہاتے ہوئے اپنے جسم کا تقابل ماماروشن سے کرتا ہے۔ پھر جب سکول جاتے ہوئے رستے میں نظر آنے والے شخص کا بھی تقابل ماماروشن سے کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ سب ماماروشن کی طرح ہوں گے اگر ایسا ہے تو وہ خود ان جیسا کیوں نہیں ہے۔ سکول پہنچ کر سارا دن ماسٹر صاحب کو بھی یہی سوچ کے تکتا رہتا ہے اور ماسٹر صاحب کچھ اور سمجھ کر اس کو چھٹی بعد روک لیتا ہے۔ یوں ماسٹر صاحب کے ہاتھوں پہلی بار شبیر کا جنسی استحصال ہوتا ہے۔

> "مغرب سے کچھ دیر پہلے ماسٹر نے اسے گھر جانے کی اجازت دی تو اس سے اپنے قدموں پر چلا نہیں جا رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کی کسی کو نہ بتانے کی دھمکی اپنی جگہ مگر آج ایک بہت بڑے جہان کا چھوٹا سا حصہ بن کر شبیر بہت خوش تھا۔ اس پر وہ سارے راز کھل چکے تھے جو آج سے پہلے گرہوں کے اندر گرہیں ڈال کر اس کے ذہن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آج کے بعد اسے کسی مرد کے جسم کا تقابل ماماروشن کے جسم سے کرانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے ننھے سے ذہن پر آشکار ہو چکا تھا کہ سر شام کہیں دور چارپائی پر سونے والا ماماروشن پوری شب اس کی ماں کے ساتھ کیوں سوتا ہے اچارپائی ٹوٹنے کے نقصان پر غصہ کرنے کی بجائے اس کی ماں ماماروشن کو دیسی گھی کے پراٹھے پر مکھن اور شکر ڈال کر کیوں کھلاتی ہے۔"[24]

جب شبیر ماسٹر صاحب کے ہر روز کے جنسی تشدد سے تنگ آیا تو اس نے سکول چھوڑ کر ایک گاموں نامی لوہار سے کام سیکھنے جا بیٹھتا ہے۔ وہاں پر شبیر کے ساتھ گاموں لوہار بھی وہی کرنے لگا جو ماسٹر صاحب کرتا تھا مگر گاموں ماسٹر صاحب کی طرح رویہ نہیں رکھتا تھا۔ گاموں لوہار کے نرم رویے نے شبیر کے پر پرزے نکل آتے ہیں اور اپنے سے چھوٹے بچوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتا ہے۔ پھر حالات شبیر کو لاہور لے آتے ہیں۔ لاہور میں شبیر منڈا منڈی کا ایک فعال رکن بن جاتا ہے۔

یہ وہ نفسیاتی، جذباتی اور سماجی ٹوٹ پھوٹ ہے جو شبیر کو ایک ڈاکو اور قاتل بنا دیتی ہے۔ وہ نہ ایک عام انسان کی طرح جی سکتا ہے نہ ہی کسی کو جینے دیتا ہے۔ خاص طور اپنی ماں کے رویے کو دیکھ کر، جو اپنی جنسی بھوک کو مٹانے کی خاطر بیٹے کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی ہے۔ والدہ، جو بچے کے لے سب کچھ ہوتی ہے۔ جب وہ ہی اپنے پیار سے بچے کو محروم کر دے، تو پھر وہ بچہ شاکا بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسرا استاد جس کو روحانی باپ کا درجہ حاصل ہے جب وہ اپنے طالب علم کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا تو بچوں کا مستقبل شبیر کی زندگی سے اندازہ کر لیں کہ کیسا ہو گا۔ محمد حفیظ کے ان

کرداروں (کاشف اور شبیر) کی طرح شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" کے کردار راجہ، شامی اور نوشا بھی سماجی جبر کے نمائندہ ہیں۔

حوالہ جات

1۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر۔ناول نگاری اردو ناول کی تاریخ وتنقید، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، 1966ء، ص33،32۔

2۔ محمد ذاکر، ڈاکٹر۔آزادی کے بعد ہندوستان کا ادب، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، 1981، ص69۔

3۔ حفیظ خان، محمد۔ادھ ادھورے لوگ، ملتان: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، 2018ء، ص20،19۔

4۔ ایضاً، ص22،21۔

5۔ ایضاً، ص22۔

6۔ ایضاً، ص113۔

7۔ انیتا اندسنگھ۔The partition of india، دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، 2006ء۔

8۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔اردو افسانہ اور افسانہ نگار، دلی: مکتبہ جامعہ، 1981ء، ص19۔

9۔ ربانی، خورشید۔محمد حفیظ خان: شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2021ء، ص31۔

10۔ حفیظ خان، محمد۔ ادھ ادھورے لوگ، ملتان: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، 2018ء، ص154۔

11۔ ایضاً ً، ص184۔

12۔ ایضاً، ص211۔

13۔ ایضاً، ص212۔

14۔ ایضاً، ص215۔

15۔ ایضاً، ص216۔

16۔ ایضاً، ص12۔

17۔ ایضاً، ص138،137۔

18۔ حفیظ خان، محمد۔کرک ناتھ، جہلم: بک کارنر پاکستان، 2020ء، ص32۔

19۔ ایضاً، ص64۔

20۔ ایضاً، ص68۔

21۔ ایضاً، ص123۔

22۔ ایضاً، ص251۔

23۔ ایضاً، ص24۔

24۔ ایضاً، ص26۔

باب سوم:

"انواسی" اور "منتارا" میں عصبیتوں اور امتیازات کی مختلف صورتیں

انواسی:

محمد حفیظ اپنے ناول "انواسی" میں دریائے ستلج اور اس کے کنارے آباد بستی آدم واہن کی کہانی کو بیان کرتا ہے۔ جب 1857 کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کو اپنے تسلط میں لیا تو انھوں نے بہت سے ترقیاتی کاموں کا آغاز کیا۔ جن میں ایک ریلوے کا نظام بھی تھا۔ محمد حفیظ نے اس کہانی کا آغاز 1872ء سے کیا جب کراچی سے لاہور تک ریلوے ٹرک کو بچھا رہے تھے۔ بہاولپور اور لودھراں کے درمیان دیائے ستلج پر پل تعمیر کر کے ریلوے لائن گزرنے کی باری آتی ہے تو وہاں پر ایک چھوٹی سی بستی آدم واہن کا قبرستان ٹریک کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے۔ انگریز حکومت تریک ڈیزائن کو پیش نظر رکھاتے ہوئے یہ فیصلہ کرتی ہے کہ یہاں سے قبرستان ختم کر کے باقیات کو دوسری جگہ پر منتقل کر دیا جائے۔ لیکن بستی کے باسیوں کو یہ فیصلہ کسی صورت بھی قبول نہیں ہوتا کیونکہ بستی کے مولوی صاحب نے یہ فتوی جاری کر دیا تھا کہ 'قبریں کھودنا شریعت میں سراسر گناہ ہے'۔ مولوی صاحب کے اس فتوی پر بستی آدم واہن کے کچھ نوجوان اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھا کر قبرستان کو مسمار ہونے سے بچانے کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ جب انگریز انتظامیہ ان لوگوں کی وجہ سے اپنا نقصان ہوتا دیکھتی ہے تو ایک دن، رات کو قبرستان کو مسمار کرتے ہوئے ان سب مزاحمتی نوجوان کو موت کی نیند سولا دیتی ہے۔ اپنے بزرگوں کی قبریں بچانے والے خود قبروں میں جاپڑتے ہیں اور یوں ریلوے ٹرک اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔

اس ناول میں محمد حفیظ نے تاریخ کے علاوہ مذہبی تعصب، نوآبادیاتی تعصب و امتیاز اور سماجی جبر کو موضوع بنایا ہے۔ ناول نگار نے فرضی کرداروں کے ذریعے تعصب اور امتیازات کو دیکھایا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی تعصب و امتیاز کیا ہے؟ نوآبادیاتی تعصب و امتیاز، نسلی اور قومی تعصب و امتیاز کا ایک جزء سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس نوآبادی یا کالونی کا مطلب ہے کہ کسی علاقے لوگوں کا دوسرے خطے میں جاکر اپنی کالونیاں قائم کرنا اور اس خطے پر قبضہ کر لینا۔ جس علاقے میں یہ کالونیاں قائم کی جاتی ہیں وہاں کے اصل مقامی افراد قابض گروہ اپنے قوانین، معاشرت اور حکومت مسلط کرتے ہیں۔ اور اصل باشندوں کا استحصال کرتے ہیں۔ جب 1800ء میں انگریز ہندوستان میں صرف تجارت کی غرض سے آئے تھے مگر جب انہوں نے یہاں کے لوگوں اور حکمران کو عیش و عشرت میں مست اور جہالت میں غرق دیکھا تو آہستہ آہستہ قابض ہوتے گئے۔ آخر کار انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو مار کر حکمرانی کا تاج اپنے سر سجالیا۔ 1857ء کی جنگ میں انگریز نے جو ہندوستانی عوام کا قتل عام کرنے کے بعد جب حکومت سنبھالی تو مقامی باشندوں پر کئی قسم کے ظلم و ستم کیے۔ ہندوستان میں لسانی تعصب اور امتیاز انگریز کے آنے سے شروع ہوا۔

ریاست بہاول پور کی ایک چھوٹی سی بستی آدم واہن کے باشندے بھی ان کے ظلم و ستم سے محفوظ نہیں رہے ۔ انہیں ہر دن مختلف قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔اس لیے ان کے اندر ایک عجیب سا خوف پیدا ہو گیا اور وہ اپنے آپ کو ہر وقت غیر محفوظ سمجھنے لگے۔اور جب کبھی کسی کو کسی بات پر تشویش ہوتی تو وہ شکایت کرنے جاتا تو اس کی بات سنی ہی نہ جاتی اور نہ ہی ان کو اپنے استحصال پر احتجاج کا حق ملتا۔انگریز جہاں کہیں بھی حملہ آور ہوئے وہاں پر عام رعایا کو ہی نقصان اٹھانا پڑا۔اس لیے بستی آدم واہن کی عوام کے ذہن میں پہلے سے ہی ان کا خوف موجود تھا جو قبرستان کی بات پر مزید بڑھ گیا۔اس لیے چند نوجوانوں کے علاوہ باقی تمام بستی کے لوگ انگریز حکومت کے سامنے خاموش ہو گئے تھے۔

سیدا کا کردار:

سیدا ناول کا ثانوی کردار ہے مگر یہ مذہبی تعصب اور نسلی تعصب میں مبتلا نظر آتا ہے۔سیدے کا تعلق مسلمان گھرانے سے ہوتا ہے اور وہ بستی کا سب سے بڑا بدماش ہوتا ہے۔سیدا اپنے باپ کی طرح بستی کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتا ہے۔سیدے کا باپ نکھیرو بھی بستی کا بدماش تھا جو بستی کے سانسیوں کی لڑکی کو غوا کر کے جلال پور کے شہر بیچ آیا تھا اور ایک بار جلال پور کے اسی زمیندار کی مدد کر کے سانسیوں کی دو اور جوان لڑکیاں غائب کروادیں۔ نکھیرو اٹھار سال کی عمر میں گھر سے غائب ہو کر مظفر گڑھ چلا گیا اور وہاں سے دو سال بعد ایک لڑکی کے ساتھ بستی آدم واہن واپس آیا تو بستی کے سب لوگوں کو لگا کہ یہ پھر کسی کی بیٹی کو غوا کر کے لے آیا ہے۔ نکھیرو نے بتا بھی کہ وہ نکاح کر کے لے آیا ہے مگر پھر بھی اس کے باپ نے مولوی کو بول کر نکاح پڑھایا گیا۔اس نکاح کے سال بعد وہ لڑکی سیدے کی ماں کہلائی۔

سیدے کی ماں افغانی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔سیدے کی ماں کے باپ دادا مظفر گڑھ میں 50 سال سے آباد تھے اور سیدا کا باپ نکھیرو ان کے ہاں ایک دو سال تک ملازمت کرتا رہا پھر ایک دن ان کی لڑکی (سیدے کی ماں) کو بھاگا آدم واہن لیے آیا تھا۔جب پانچ سال بعد نکھیرو (سیدے کا باپ) کے دشمنوں سانسیوں کو سیدے کی ماں کے خاندان کا علم ہوا تو انہوں نے فورا مظفر گڑھ جا کر ان کو خبر دی کہ آپ کی لڑکی کو نکھیرو بستی آدم واہن میں رکھے ہوئے ہے۔پھر افغانیوں نے سانسیوں کی مدد سے بستی آدم واہن میں آ کر نکھیرو کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر نکھیرو بچا گیا۔اس حملے کے کچھ عرصے بعد نکھیرو خود مر گیا۔

سیدے کے اندر نکھیرو کے خون کے ساتھ ہی افغانیوں کا ترکا بھی لگا ہوا تھا۔جس کی وجہ سے بستی کا ہر آدمی اس سے ڈرتا تھا اور اس کے خلاف کسی میں آواز اٹھانے کی جرات نہیں تھی۔جب انگریز سرکار نے بستی کے قبرستان کو

مسمار کرنی کی بات کی تو سب پہلے سیدا ہی اپنے ساتھیوں سمیت قبرستان کے چاروں طرف پہرا دینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ناول میں یوں ذکر ہے۔

"نوجوان کا خیال تھا کہ گورے صاحب کے اس حکم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے جس کی رو سے وہ ان کی بستی کے قبرستان کو برباد کر کے وہاں سے جنات کی فولادی بگھی گزارنا چاہتا ہے۔ اب بھلا کہاں لے جائیں گے وہ اپنی پیڑھی کے وڈکوں کی قبریں۔ کیا ان کے ہوتے ہوئے بھی ان کی جداد کی لاشیں اور ہڈیاں چیلوں اور کتوں کے کھانے کے لیے قبروں سے نکال باہر پھینکی جائیں گی؟ وہ مر جائیں گے مگر اپنے جی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ معاملہ صرف اس حد تک بھی نہیں تھا، وہ تو ان کے تن کو اجاڑ کر، ان کی کشتوں کو بے کار کر کے ان کے دریا پر لوہا ڈال کر اسے سکھانا چاہتا ہے۔ جب دریا میں پانی رہا نہ مچھی تو کھا جا کیا خاک ہو گا؟ اس سے پہلے بھوک اور پیاس سے مریں، کیوں نہ سب کو مار کر مریں۔"[1]

اس اقتباس سے یہ بات واضع ہو رہی ہے کہ بستی کے نوجوان سیدے اور اس کے ساتھی کس قدر اپنے اجداد سے محبت کرتے ہیں۔ محبت کی وجہ سے وہ نسلی عصبیت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ان کو اپنے اعلاقے اور ملک کی ترقی نظر نہیں آتی بلکہ انہیں اپنے اجداد کی قبریں زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ انگریز سرکار کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب بستی کے بڑے ان کو سمجھاتے ہیں کہ انگریز سرکار کے فیصلے کی مخالفت نہ کرو اسی میں آپ کی بہتری ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انگریز کبھی بھی اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹنے والے وہ ساری بستی کو قبرستان بنا کر اس کے اوپر سے ریلوے لائن بچھائے گا۔ اس لیے مٹھل ماچھی نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ انگریز سرکار سے ٹکر نہ لیں اور ان کو بتایا کہ آج سے کئی برس قبل ملتان فتح کرنے کے بعد سکھوں نے بہاول پور پر حملہ کیا تھا تو ان کی پشت پناہی انگریز نے کی تھی۔ مٹھل ماچھی نے مشورہ دیا کہ اپنے اجداد کی قبریں کہیں اور بنا دیتے ہیں۔ اس مشورے پر سیدا مٹھل ماچھی پر غصہ ہوا اور اس کو مارنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بات تب زیادہ بگڑ جاتی ہے جب مٹھل ماچھی اور بستی کے باقی بزرگوں کے مشورے کے خلاف مولوی صاحب ایک فتویٰ جاری کر دیتا ہے جس میں وہ شریعت کا حوالے دیتا ہے تو سیدا پہلے ہی مٹھل کو قتل کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے اب تو اس کا ارادہ مزید پختا ہو جاتا ہے۔ ناول کے الفاظ میں۔

"مگر مٹھل ماچھی کے مشورے پر مولوی جار اللہ نے یہ کہہ کر رندا پھیر دیا کہ ایسا کرنا میت کی توہین، صریحا کفر اور گناہ کبیرہ ہے۔ اب مولوی کے فتوے کے بعد کس کی مجال کہ کوئی اختلاف کرے لہذا وہاں بیٹھے ہوئے سب نے چپ سادہ لی۔

مٹھل ماچھی کا قبرستان سے وڈکوں کی ہڈیاں نکال کر کہیں اور دفنانے کا مشورہ بستی کے باہر کھڑے نوجوان تک پہنچا تو وہ مزید بپھر گئے۔

آخر کو ہے نا حرامی یہ وڈکو کڑا۔۔۔ قبر میں لاتیں ہیں اور چلا ہے وڈکو کی قبریں اکھاڑنے۔ سیدے کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں ابھی جا کر اتارتا ہوں اسے قبر میں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور بستی کی طرف لپکا۔ سیدے کو بستی کی طرف لپکتا دیکھ کر اس کا دوست سکندرا بھی تین چار جوانوں کے ساتھ بستی کی طرف بڑھا کہ اس کا ساتھ دے سکے مگر پیرو در کھان کا کڑیل بیٹا منگر اپنے دس بارہ ساتھیوں کے سمیت ان کی راہ میں روک کر کھڑا ہو گیا۔"[2]

سیدے کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے منگر آتا ہے۔ منگر وہ نوجوان ہوتا ہے جو بستی میں سیدے کی طرح طاقت اور جرت مند تھا مگر سیدے کی طرح جذباتی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر معاملے کو سوچ بچار کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے وہ سیدے کو بھی سمجھتا ہے کہ مٹھل ماچھی کی بات غلط نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات اس نے غلط وقت میں کر دی ہے اگر اس مٹھل ماچھی کی بات پر تم ذرا غور کرو تو سمجھ آ جائے گی۔ لیکن سیدا نسلی اور مذہبی عصبیت میں اس حد تک گرفتار ہوتا ہے کہ وہ اپنے خلاف ہر آدمی کا قتل کرنے پر تولا ہوتا ہے۔ اس نے منگر کی ایک بات تک نا مانی اور منگر کو یہاں تک کہا کہ اگر اب مولوی بھی اپنا فتویٰ واپس لے بھی تو سیدا اپنا ارادہ نہیں بدلے گا۔ قبرستان کی ایک قبر بھی میرے ہوتے ہوئے نہیں مسمار ہو سکتی۔ سیدا غصے میں آ کر جو منگر کو جواب دیتا ہے اس کو ناول نگار نے یوں لکھا ہے۔

"منگر ہو جانے دے مٹی کے ساتھ مٹی اور خون خرابہ بھی۔ کم از کم یہ تو ہو گا کہ ہم اپنی آنکھوں سے اپنے وڈکوں کی بھرتی ہوئی ہڈیاں اور گلا سڑا ماس تو نہیں دیکھ سکیں گے نا!۔۔۔ اور سنو! میں آج قسم لینے جا رہا ہوں بستی کے سارے جوانوں سے کہ آخری دم تک کوئی بھی گوروں کو بستی میں گھسنے نہیں دے گا۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ اگر تم بھی ہمارا ساتھ دینا چاہو تو دیگر ویلے چڑھدے والی ڈھنڈ کے پاس قسم دینے آ جانا۔"[3]

سیدا اور اس کے اسی (80) ساتھی قرستان کی حفاظت کے لیے دن رات پہرہ دینے لگے۔ سیدے نے اپنے ساتھیوں کو منصوبے کے مطابق قبرستان کی ان سمتوں کی طرف کھڑا کر دیا جہاں جہاں سے ریلوے لائن گزرنی تھی۔ کچھ دنوں تک جب انگریز سرکار نے کوئی حملہ وغیر نا کیا تو سیدے کو ایسے لگا کہ انگریز سرکار اس سے ڈر گی ہے مگر پھر

بھی یہ خیال آتا کہ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سیدا کو اپنی موت کا ڈر نہیں تھا بلکہ وہ سنگری کے بارے میں فکر مند تھا۔ سنگری جو سیدے کی منگتر تھی بلکہ بچپن ہی میں سیدے کے ساتھ اس کا نکاح بھی ہو گیا تھا مگر ان کی ابھی تک شادی نہیں ہو پائی تھی۔ سیدے کو جیسے ہی سنگری کا یہ خیال آتا کہ میں انگریز سرکار کے ہاتھوں مارا گیا تو سنگری کیا ہو گا۔ سیدے نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ قبرستان کو انگریز سرکار کو دے کر ان سے کہے کہ یہاں سے ریلوے لائن گزر لے۔ میں سنگری کو کسی اور کا نہیں ہوتا دیکھ سکتا کہ کوئی دوسرا اس کو چھوئے یہ سیدا برداشت نہیں کرتا۔ مگر پھر سیدے کا اپنے اجداد سے محبت کا جذبہ ابھرتا ہے اور پھر وہ انگریز سرکار کے سامنے ڈٹ جاتا ہے۔ اب اس نے سوچا کہ سنگری ابھی اس کے جسم کا حصہ نہیں بنی ہے۔ وہ خود جن جسموں کا حصہ ہے وہ ان جسموں کی تذلیل ہوتی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سیدا میں موجود نسلی عصبیت ہی ہوتی ہے جو اسے اپنے مشن میں کسی صورت ہٹنے نہیں دیتا ہے۔ ناول کا اقتباس کچھ یوں ہے۔

> "تو کیا ہو گیا؟ یہ تو ہوتا آیا ہے، جو وجود ابھی تک اس کا ہوا نہیں، اس کے ساتھ مکلایا نہیں، وہ کسی ایک کا کیا، لکھ ہزار کا ہو جائے تو اسے کیا۔ وہ جوان قبروں میں لیٹے ہیں، وہ تو اس کے ماضی کا وجود ہیں، ان کے ماس سے تو وہ کشید ہوا ہے، وہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ ہوتا۔ وہ ان کے وجود کا رکھولا ہے، ان کی مٹی کا راکھا ہے، وہ مٹی جو اس کی اپنی ہے، وہ مٹی جو اس کے وجود کا تسلسل ہے، نہ کہ وہ جسم جو ابھی اس کا ہونا ہے۔"[4]

سیدا نسلی اور مذہبی عصبیت کی وجہ اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے ایک دن انگریز سرکار کے حملے سے بستی سے غائب ہو جاتا ہے۔ سیدے کے ساتھی کچھ تو مارے جاتے ہیں اور کچھ گرفتار ہو جاتے ہیں مگر سیدا کا کوئی علم نہیں ہوتا ۔ بستی کے لوگ سیدے کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں کبھی کہتے ہیں سیدا انگریز سرکار کی قید میں ہے اور کبھی کہتے کہ سیدا کہیں فرار ہو گیا ہے۔ جو کچھ عرصے بعد ضرور واپس آئے گا۔ لیکن کئی سال گزر جانے کے بعد بھی سیدے کا کوئی نام و نشان تک نہیں ملتا ہے تو لوگ سمجھ جاتے ہیں اب سیدا کہیں مر گیا ہے۔

انگریز انتظامیہ کا کردار:

نو آبادیاتی 1 نظام برصغیر پاک و ہند میں اٹھارویں صدی کے وسط سے لیے کر انیسویں صدی کے نصف تک قائم رہا۔ نو آبادیاتی نظام سے مراد ہے کہ کسی طاقتور خطے کی عوام کا کسی کمزور علاقے پر قابض ہو جانا اور اس کمزور خطے کی عوام پر اپنے قوانین، معاشرت اور حکومت مسلط کر دینا، اسے نو آبادیاتی نظام کہتے ہیں۔ جب یورپ میں زرعی نظام کی جگہ صنعتی نظام نے لی تو وہاں پر بہت سے کارخانے اور فیکٹریاں لگنے لگی۔ صنعتی ترقی کی دوڑ میں یورپی اقوام ایک

دوسرے سے سبقت حاصل کرنے میں مصروف عمل ہوگئی۔اس وقت ان کے پاس بھاری صنعتوں کے لیے خام مال کی بہت کمی تھی۔ جسے پورا کرنے کے لیے انھوں نے ایک منصوبہ بندی کے تحت اپنے کمزور اقوام کے علاقوں کا رخ کیا اور وہاں جا کر اپنی کالونیاں بنائیں۔اس سارے عمل کو نوآبادیات کہا جاتا ہے۔ان کا بنیادی مقصد تو معاشی مفاد حاصل کرنا تھا مگر کچھ عرصہ بعد انھوں نے مقامی باشندوں کو اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعے ذہنی غلام بنانا شروع کر دیا۔اور ان خطوں میں اپنے قوانین کا اجراء کیا،اپنا نظامِ سیاست متعارف کروایا۔

نوآبادیاتی نظام کو ہندوستان میں اس وقت زیادہ مستحکم کیا گیا جب 1800ء میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو وہاں پر اشتراقی مطالعات کا ایک نیا ماڈل،ایک نئی نہج کی تشکیل سے نوآبادیاتی نظام کو مزید مستحکم کر گئی۔ مشرقی تہذیب و تمدن کا مطالعہ حاکمانہ فکر کے زیر اثر ہونے کے نتیجے میں شعریات پر سیاست کا رنگ گہرا ہو گیا۔تاریخ سازی میں عصبیت اور گروہیت کو راہ ملی۔ مذہب کی نئی تفسریں اور تعبریں بیان کی گئی۔ عقائد کو شکوک کے دائرے میں لا کھڑا کیا گیا۔اس طرح دیکھا جائے تو برصغیر میں استعماری قوت کے پھیلاؤ کا آخری زمانہ بہت خطرناک تھا ۔اس زمانے میں جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی اسیری کا آغاز ہوا ہے۔تاریخ کے وسیلے سے ثقافتی بیانیے کی تبدیلی کی جو نئی روش اٹھارویں صدی کے وسط سے شروع ہوئی تھی وہ یہاں آکر اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔

محمد حفیظ نے اپنے اس ناول "انواسی" میں نوآبادیاتی تعصب کو دیکھانے کی بھی کوشش کی ہے۔نوآبادیاتی عصبیت، نسلی اور معاشی عصبیت کی صورت سے پیدا ہوتی ہے۔ جب برصغیر میں انگریز آکر آباد ہوئے تو انہوں نے اپنی الگ کالونیاں بنائیں۔انگریز خود کو اعلیٰ نسل تصور کرتے تھے اور ہندوستانیوں کو کمتر سمجھتے تھے۔اس کی تین وجہات تھیں۔ سب سے پہلے نسل پھر زبان اور تیسری وجہ علاقہ تھا۔اس لیے انگریزوں نے نسلی، لسانی اور علاقی تعصب کی بنیاد پر ہندوستانیوں پر ظلم و جبر کیا۔اس کے علاوہ سیاسی اور معاشی مفاد کی خاطر جو ہندوستانیوں پر ستم کئے۔

> "سب سے پہلے برطانوی سرمایہ ریلوی پر لگایا گیا اور اس میں برطانیہ کی لوہا اور فولاد بنانے والی کمپنیوں اور بالخصوص انجینئرنگ فرموں کے اعراض مدِ نظر تھے، لیکن سب سے زیادہ ریلوں کی توسیع میں برطانوی کارخانوں کا فائدہ نظر آتا تھا کہ برطانیہ کی تجارت کا جال ہندوستان میں جلد از جلد پھیل جائے۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی کاروبار کے زمانے میں دولت کی کثیر مقدار ہندوستان سے کھینچ لی تھی جس نے انگلستان پہنچ کر بہت بڑے سرمایہ کی شکل اختیار کر لی تھی اور دراصل وہی سرمایہ تھا جو اب ہندوستان میں لگا دیا گیا۔"[5]

اس حوالے سے غلام اصغر کا بیان ہے۔

"نوآبادیاتی تسلط سیاسی اور معاشی دونوں طرح سے ہوتا ہے۔ عام طور رنوآبادیات مغلوب قوم کی زمین، خام مال، محنت مزدوری اور دیگر وسائل کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ استحصال وہ اکیلے نہیں کر سکتے بلکہ انھیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مقامی لوگوں سے کمک درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے "اندرونی استعمار" یا "داخلی نوآبادیات" کی تراکیب بنتی ہیں۔ داخلی نوآبادیات کسی ایک قومی ریاست یا معاشرے کے اندر "مرکز" اور "مضافات" کے درمیان استحصالی تعلقات کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کا اطلاق امریکا میں سفید وسیاہ تعلقات اور سوویت ریاست اور سوویت سماج کے درمیان استحصالی تعلقات کو بیان کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے (خاص طور پر کسانوں کے حالات جبری اجتماعیت کے تحت اور محنت کش طبقہ کے مسلط شدہ کاری کے تحت)۔"[6]

اس ناول میں نوآبادیاتی دور کے ریلوے نظام کی کہانی بیان کی گئی ہے جس میں ناول نگار نے ایک چھوٹی سی بستی کا قبرستان ریلوے لائن کی راہ میں آرہا تھا۔ انگریزوں نے اس قبرستان کو مسمار کر کے وہاں سے ریلوے لائن گزار دی اور اپنے اس سرمائے یا مفاد کی خاطر اس بستی کے کئی انسانوں کا خون بہا ہے۔ اس ایک واقعے سے ناول نگار نے نوآبادیاتی نظام کے پورے دور کی عکاسی کی ہے کہ گوری سرکار کس طرح برصغیر کے اصل باشندوں پر ظلم وستم کرتے تھے اور اپنے مفادات کو حاصل کرتے تھے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ جب انیسویں صدی میں یورپ میں ریلوے انجن ایجاد ہوا تو برطانیہ نے اس کو اپنے نوآبادیاتی علاقوں تک توسیع دینی شروع کی۔ 1849ء میں اس نظام کو برصغیر پاک وہند میں بھی لانے کا سوچا گیا۔ جو چند سال بعد برصغیر میں کام شروع ہو گیا۔ اس کا ناول میں یوں بیان ہے۔

"انگریز سرکار کو برطانوی ہند میں ایک ایسا نظامِ نقل وحمل چاہئے تھا جو صرف سستا، جدید اور کثیر المقاصد ہو بلکہ محفوظ اور تیز رفتار بھی ہو۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں دخانی انجن کی ایجاد نے پہلے ہی یورپ میں انقلاب برپا کر رکھا تھا لہذا کیسے ممکن تھا کہ اسے برطانیہ کے زیر نگیں نوآبادیاتی خطوں تک توسیع نہ دی جاتی۔ سو پورے ہندوستان میں کئی ریل کمپنیوں کا قیام عمل میں لاتے ہوئے اپنے اپنے ریجن کی سطح پر ریلوے ٹریک بچھانے کے کام کا آغاز ہو چکا تھا۔"[7]

جب 1855ء میں انگریز انتظامیہ نے کراچی کی بندگاہ کو لاہور کی منڈویوں تک ریلوے لاین کے ذریعے جوڑنے کا کام شروع کیا تو سنڈی کمپنی کو 108 میل طویل کراچی تا کوٹری تک ٹریک بچھانے کا کام سونپا گیا جو 1861ء میں مکمل کر لیا گیا۔ جب کہ دوسری پنجاب ریلوے کمپنی نے لاہور کو ملتان سے جوڑنے کا منصوبہ 1865ء تک مکمل

کیا۔اب صرف ملتان کو کوٹری سے جوڑنا تھااس کے لیے 1871ء میں "انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے" کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس کے تین ڈویژن بنائے گے ملتان کو روہڑی، روہڑی کو سکھر اور سکھر کو کوٹری سے ملانے کے لیے بیک وقت کام کا آغاز کر دیا گیا۔ مگر اس سب معاملے میں مسئلہ تب بنا جب بہاول پور اور بستی آدم واہن کے درمیان دریائے ستلج پر پل تعمیر کرنے کی باری آئی۔

آدم واہن کی بستی دریائے ستلج کے کنارے پر آباد تھی اس بستی کا ایک قدیم قبرستان تھا جو ساری کہانی کا مرکز بھی ہے۔ یہ قبرستان ریلوے ٹریک کے رستے میں آرہا تھا اس کو انگریز انتظامیہ مسمار کر کے ٹریک بچھانے کی کوشش میں تھی لیکن بستی کے لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو انگریزوں نے یہ دیکھ کر کچھ عرصہ کام روکے رکھا مگر جب دیکھا کہ بستی کے لوگ کسی صورت بھی پیچھے نہیں ہٹ رہے تو انگریز انتظامیہ نے ایک رات آپریشن کر کے قبرستان کو مسمار کر دیا اور جو جو اس کی رہ میں آیا اس کو قتل کر دیا۔یعنی کے قبرستان کو بچانے والے خود قبروں میں چلے گے۔اس واقع کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے۔

> "آدم واہن میں ہونے والے آپریشن نے محض ایک قبرستان اکھیڑ کر بستی کے ہر گھر میں قبرستان بنا دیا تھا۔ بستی میں امن کی خبریں رکھنے والوں کو گمان بھی نہ تھا کہ بیس لاشیں تو ان جوانوں کی دفن ہوئیں جو گورے فوجیوں کی حملہ آوری کا نشانہ بنے لیکن ان سے ہٹ کر بھی وہ کون سا گھر تھا کہ جس کے وڈکوں اور اقربا کی مدفون لاشیں ایک ذلت آمیز مہاجرت کا شکار نہ ہوئی ہوں۔انگریز انتظامیہ کے حکم پر بستی کی شمال مغربی سمت میں ایک نیا قبرستان تو کسی تعمیلی پروانے کی طرح وجود میں آچکا تھا مگر وہاں از سر نو دفن کی گئی لاشوں کی باقیات، زیر زمین ھینک دے جانے کے باوجود غیر مدفون تھیں کھلے آسمان کے نیچے بکھری ہوئی موت کی طرح تسور ہی نہیں تھا کہ ان کے اپنوں کے بعد از مرگ ٹھکانوں کی اس طور بھی اکھاڑ پچھاڑ ہو سکتی ہے۔یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بستی والے اپنے ماضی سے جبراً بے دخل کر کے اپنے زمانہ حال میں پھینک دے گئے ہیں۔ان کے آبا کی قبروں کی کشائی کیا ہوئی، بستی والوں کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی۔"[8]

سنگری کا کردار:

سنگری اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بولڈ لڑکی ہے۔یہ ضدی، خود سر اور من مانی کرنے والی لڑکی ہوتی ہے۔یہ اپنے مزاج اور فکر و احساس کی وجہ سے مشکلات میں گھری رہتی ہے اور ایک

دن سیلاب کے دوران ملبے کے نیچے دب کر مر جاتی ہے۔ یہ لڑکی ازل سے معاشرے کی زنجیروں میں قید رہتی ہے۔ سنگری دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے خوابوں میں ایک شہزادا بسائے رکھتی ہے اور اس شہزادے کی خوبیاں بھی گنواتی ہے۔

"مرد تو وہ کسی کام کا ہوتا ہے جو عورت کے ترلے نہ کرے، نیچے لگا کے رکھے مگر پیار سے۔ تھپڑ مارے مگر جوتا نہیں۔ خود بے شک مار مار کے نیلو نیل کر دے، چمڑی ادھیڑ دے مگر کسی اور کو انگلی نہ کھڑی کرنے دے۔ بستی کا وڈکانہ ہو مگر وڈکوں جیسا ہو، وہ گالیاں بھی دے تو کانوں میں ماکھی ٹپکے، ظلم کرے تو اس پر پیار آئے۔ وہ قدم بھرے تو بھوئیں کو کانبا ہو۔ چاند نکلے تو وہ مشکی سانپ کی طرح کالا لگے اور رات کالی ہو تو چاند بن جائے۔ پوہ میں ٹھنڈی لوری چلے یا ہاڑ میں تتی لو پورا پنڈا اس کی تانگھ میں ہوں ہوں کرنے لگے۔ بادل گرجے تو وہ یاد آئے اور دریا چڑھے تو اس کا سینہ سامنے ہو۔"[9]

لیکن سنگری کا یہ خواب، خواب ہی رہتا ہے کیونکہ سنگری کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے ہے جہاں پیدا ہوتے ہی بچوں کے نکاح کر دیے جاتے ہیں۔ سنگری کے والدین نے بھی بچپن میں اس کا نکاح سیدے نامی لڑکے سے کر دیا تھا۔ سیدا جو جوان ہو کر بستی کا سب سے بڑا بدمعاش بن جاتا ہے۔ سنگری کو سدا اس لیے بھی اچھا نہیں لگتا ہے کیونکہ سنگری اپنے حسن پر نازاں ہوتی اور وہ چاہتی ہے کہ دوسری لڑکیوں کی طرح بستی کے لڑکے اس کو بھی چھڑے لیکن سیدے کی نسبت کی وجہ کوئی بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

ایک دن سنگری سیدے کے پاس جاتی ہے جب وہ قبرستان کا پہرا دے رہا ہوتا ہے۔ سنگری غصے میں سیدے کو کہتی ہے کہ اگر تجھے مرنے کا اتنا شوق تھا تو تو نے پھر مجھے اب تک اپنے نکاح میں کیونکہ رکھا ہوا ہے۔ وہ سدے کو گلیاں سنا کر اور دھمکیاں دے کر گھر لوٹ آتی ہے۔ کچھ دن بعد سیدا سنگری کو اس کی اشتعال انگز باتوں پر گھر سے رات کو اغوا کر لیے جاتا ہے اور اس کے ساتھ جنسی تشدد کرنے کے بعد زندہ درگور کر دیتا ہے۔

سنگری ایک ایسی عورت ہے جو نسلوں کی پرورش فطری جذبے کے تحت کرنے کا شعور رکھتی ہے۔ وہ سیدے کے زبردستی زیادتی کو اپنی جان سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اس کے بچے کی زندگی کی خاطر وہ بستی کے مولوی جار اللہ سے شادی کر لیتی ہے تاکہ کوئی اس پر بدکاری کا الزام نہ لگا سکے۔ جب مولوی صاحب سے شادی کو چھ ماہ ہوتے ہیں تو سنگری کا بیٹا پیدا ہوتا ہے جس کا نام امانت رکھتی ہے کیونکہ وہ اس بچے کو سیدے کی امانت سمجھتی ہے۔ مولوی صاحب کی موت کے بعد سنگری مزید مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے۔

مولوی جار اللہ کا قتل مذہبی عصبیت میں مبتلا افراد کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ جب بستی آدم وہن کا قبرستان مسمار کیا گیا تو اس میں ساتھ درویشوں کے ساتھ شہیدوں کی قبریں بھی شامل تھیں۔ ان درویشوں سے صرف دین اسلام کے لوگوں کو ہی عقیدت نہیں بلکہ دوسرے تمام مذاہب کے لوگوں کو ان سے محبت و عقیدت تھی۔ بستی اس وقت میدانِ جنگ کا منظر پیش کرنے لگی جب سال بعد زندہ پیر کے میلے پر چالیس درویش آئے اور انہیں اپنے سات شہیدوں کی قبروں کی کوئی نشانی نہ ملی تو وہ رونے لگ گئے۔ اس کا ناول میں یوں ذکر ہوا ہے۔

> "شہیدوں کی قبروں کے ساتھ اس قسم کا سلوک بھی ہو سکتا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ تھی کہ جن بستی والوں کو دریائے ستلج کے ہر سال عذاب سے بچانے کے لیے شہیدوں نے یہاں دفن ہونے کی وصیت کی تھی انہی شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہیں کی گئی۔ درویش دہائی دے رہے تھے کہ اگر واقعی شہیدوں کی قبروں کی بے حرمتی کی گئی ہے تو اس میں اب آدم کا ٹھکانہ ممکن نہیں رہا ان کے نزدیک شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہ کر سکنا بھی ان کی بے حرمتی ہی تھی۔"[10]

سماجی اور مذہبی عقائد کے افراد جب مل جاتے ہیں تو وہ ایک خطرناک جنون کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بستی آدم واہن میں مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد تھے۔ مولوی جار اللہ کا تعلق اس مسلک سے تھا جو ان لوگوں پسند نہیں کرتا تھا جو ہر سال زندہ پیر کے میلے میں آتے تھے۔ دوسرا انگریزوں کے ظلم و ستم کی انتہا یہ تھی کہ انہوں نے قبرستان کو مسمار کر کے بستی کے مذہبی لوگوں ٹھس پہنچائی تھی۔ جس کی وجہ پھر مذہبی عصبیت سامنے آئی اور بستی میدانِ جنگ بن گئی۔ ان چالیس درویشوں کے ساتھ بستی کے سب لوگ مل کر مولوی جار اللہ کو قتل کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ جس کا ناول میں یوں بیان ہے۔

> "اسی دوران کسی نے وہاں خبر اڑا دی کہ سات شہیدوں کی قبروں کو مسمار کرا کر ان کے آثار مٹانے میں مولوی جار اللہ کا ہاتھ ہے کہ جو مخالف مسلک کے پیروکاروں کا کرنا دھرنا ہونے کے ساتھ ساتھ پیر زندہ کرامت کے میلے کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔"[11]

ایسے حالات میں لوگ انسانیت اور عقل سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر اس شخص کو اپنا دشمن مناتے ہیں جو ان کے بارے میں کبھی کسی رائے کا قائل ہوا ہو۔ ہجوم میں لوگوں کا اضافہ اس قدر ہوا کہ بستی والوں کو یہ احساس بھی نہ رہا کہ ان کے ساتھ کون شخص کھڑا ہے۔ اس جنون کی کیفیت میں مولوی جار اللہ کو قتل کر ڈالا۔ اسطرح ایک بااثر شخصیت پل بھر میں ایک لاش کی شکل میں بدل گیا۔ وہ بھی بے قصور ہوتے ہوئے۔ مولوی صاحب کا ادب و احترام

کرنے والے افراد نے ہی اس کے گھر کو آگ لگادی۔ اصل اس محرک کے پیچھے وہ لوگ تھے جو مذہب کی آڑ میں ان افراد کے اندار انتہا پسندی پیدا کر دیتے ہیں کہ ان سب کے درمیان پھوٹ ڈال کر ان کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ مولوی صاحب کے مر جانے بعد جہاں اس کی وراثت اور جانشینی کا تھا وہیں پر سنگری کو اپنے بیٹے کے لیے محافظ کی ضرورت ہوئی۔

مولوی جار اللہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے مولوی اللہ بخش عرف بخشو کو جانشین بنادیا جاتا ہے۔ جو مولوی جار اللہ کے چھوٹے بھائی مولوی اللہ رکھے کا ہم عمر تھا مگر بخشو اپنے اثر ورسوخ کی وجہ جانچین بن جاتا ہے۔ مولوی بخشو نے سنگری پر غلط نظر رکھنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ سنگری کے پاس آنے جانے لگتا ہے۔ سنگری مولوی بخشو کی حرکت سے اس کی نیت سمجھ جاتی ہے۔ سنگری کے لیے آئے دن مشکل بڑی رہی تھی۔ مولوی بخشو ہر طرف سے سنگری کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش میں تھا۔

> "مولوی اللہ بخش جیا جیا اور جیول جیول کر پوچھتا کہ ہئیں جی! سنا تو یہ تھا کہ چھ ماہیا بچہ بچ نہیں پاتا۔۔۔ مگر یہ امانت ہے بہت خوش قسمت کہ چھ ماہیا پیدا ہو کر بھی ماشااللہ بچ بچا گیا ہے۔ سنگری جو نہی چوٹ کھا کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ ڈسنے والے انداز میں مسکرا دیتا۔ ویسے ماشاءاللہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ چھ ماہیا پیدا ہوا ہے۔۔۔ قدبت سے تو پورا پکا نو مہینے کا۔ پھر مزید زہر انڈیلنے کے واسطے مسکراہٹ کچھ اور گہری کر لیتا ہے۔ ویسے اللہ بخشے حضرت والد صاحب بھی خوب تھے صلہ رحمی میں توحد سے گزر جاتے تھے۔"[12]

اس طرح سے مولوی بخشو نے سنگری کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مولوی بخشو نے جانشیں ہونے کا فائدا اٹھا کر سنگری کا استحصال کرنے لگ گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں گھر کا بڑا ہو تو میری ہر بات کو سچ مانا جائے گا۔ اس لیے وہ سنگری کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کی خواہش کی تکمیل کرے۔ مگر دوسری طرف سنگری ایسا کرتی بھی تو اپنا استحصال کرواتی اور اگر انکار کرتی تو بھی استحصال ہوتا۔ ان سب مشکلات سے نکلنے کے لیے سنگری مولوی اللہ رکھے کا سہارا تلاش کیا۔ مولوی اللہ رکھے کو زنانہ خانے میں بلا کر اس کو اپنا آپ سونپنے کی بات کیا اور مولوی اللہ رکھا سنگری کی باتوں میں آگیا تھا۔ جب مولوی اللہ رکھا بڑے زنانہ خانے میں گیا تو وہاں اس پر اس کو ظلم و ستم کر کے مار ڈال تھا۔ مولوی اللہ رکھے کی موت کا الزام سنگری کے سر پر ڈال کر مولوی بخشو پھر سے سنگری کو مجبور کرنے لگ جاتا ہے۔

آخر کار سنگری بے بس ہو کر مولوی بخشو کی خواہش کی تکمیل کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔اسطرح بخشو خوش ہو جاتا ہے اور سنگری کے گھر اناج اور دوسری ایشاء ضرورت آنے لگ جاتی ہیں۔اس طرح ایک دن مولوی بخشو سنگری کے ساتھ نکاح کر لیتا ہے۔ سنگری مشکلات کا سامنا کرتے کرتے ایک دن سیلاب میں مر جاتی ہے۔

محمد حفیظ نے سنگری کے کردار کے پس منظر میں دسماجی جبر کا شکار عورت کا نوحہ پیش کیا ہے۔ عورت ذات کے سماج سے ، یہاں کے مقتدر طبقے سے اور اپنے ان داتا سے احتجاج کی ایک تصور ملاحظ کیجے اور اس دکھ کو سمجھنے کی کوشش بھی جو اس عورت کو لاحق ہیں۔

> "کتنی بد قسمت ہے عورت اس دھرتی کی کہ کسی مرد کی غیرت کے باڑے میں جنم لے کر آزادی اور چاہے جانے کے خواب دیکھتے ہوئے کبھی ہاری ہوئی جنگ کا تاوان بن کر قیمت چکاتی ہے اور کبھی اس کی اگلی نسل کی بڑھوتری کے ڈھکوسلے میں بار بار دیواروں میں چنوائی جاتی ہے،انانیت کے نام پر مصلوب ہوتی ہے اور تلذذ کی آڑ میں تذلیل جھلیتی رہتی ہے۔"[13]

سنگری اپنی زندگی میں ان تمام امتیازات اور ناانصافیوں کا سامنا کرتی ہے۔جو معاشرے کی ہر عورت کو کرنا پڑتا ہے، صنف کی وجہ سے ایک عورت کو سماج میں بہت سے مسائل پیش آتے ہیں۔ مگر اس زمانے میں انگریزی تسلط کے زیر اثر مردوں کی ذہنی حالت نے عورت کا زندہ رہنا مشکل کر دیا تھا۔

> "او میری ماں تو تو جانتی ہے کہ یہ باتیں ہمیں اور کوئی نہیں سکھاتا، پیدا ہوتے ہی ہمارا عورت ہونا ہمیں یہ سبق پڑھانا شروع کر دیتا ہے۔اب مکرے تو اور بات ورنہ یہ باتیں تجھے بھی معلوم ہیں اور مجھے بھی معلوم ہوتی جا رہی ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ تو انہیں زبان سے نکالنا نہیں چاہتی اور مجھے وہ حرامی سیدا زبان سے نکالنا سکھا گیا ہے۔وہ ویسا ہی مرد تھا جیسا میری طرح کی عورت کو چاہیے ہوتا ہے مگر اس دھی چود کو میری "ناں" کو سمجھنا ہی نہیں آیا، بجائے میری چمڑی ادھیڑنے کے ، میرے اندر ہی تھوک کر چلا گیا اور وہ بھی زبردستی۔ان بھڑوے مردوں کو پتا ہی نہیں کہ عورت ہے کیا اور کیا چاہتی ہے۔یہ عورت کو اس کے چڈے چیر کر فتح کرنا چاہتے ہیں۔جب کہ عورت کہتی ہے کہ میرا دل چیر کر مجھے فتح کرو مگر یہ حرامی اپنی اکڑ خانی قائم رکھنے کے چکر میں نہ دیکھ پاتے ہیں اور نہ

سن پاتے ہیں، بس ترلے کرتے ہیں، تلوے چاٹتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہ بن سکے تو جانوں مار دیتے ہیں۔"[14]

منتارا:

محمد حفیظ نے اپنے اس ناول میں سیاست اور اقتدار کی کشمکش کے ساتھ عورت ذات کو بطور جنس موضوع بنایا ہے۔اس ناول کے نام "منتارا" کا مطلب ہے کہ ایک ایسا شخص جس کو تیرنا تو نہ آتا ہو مگر وہ خود بہت بڑا تیرک کہتا ہو۔اس ناول میں ہمارے ملک کے سیاست دانوں کی اقتدار تک رسائی کی عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح ہمارے ملک میں حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں اور کس کس کو کس کے کہنے پر حکومت یا اپوزیشن میں بیٹھایا جاتا ہے۔اس طرح سیاست دان اپنی عیاشوں کے لیے عورت کو صرف ایک جنس سمجھ کر استعمال کرتے ہیں اور اسے اپنے مفادات کے لیے سیاسی طوائف بنا دیتے ہیں۔یہ کہانی ایک عام منظر و پس منظر میں کولمبو اور پھوکٹ کے ساحلوں سے شروع ہوتی ہے اور پھر حسن و عشق کے معاملات سے ہوتی ہوئی آخر میں سیاسی اقتدار کی خاطر خون آلود واقعات پر ختم ہو جاتی ہے۔مخدوم ناظر حیات اور نائلہ کے کردار مذکورہ صورت حال کے نمائندے ہیں۔مخدوم ناظر حیات ایک روایتی سیاست دان ہوتا ہے اور اس کے شب و روز حسیناؤں کے ساتھ گزرتے ہیں۔اس کے ساتھ اس کا بیٹا ہادی حیات، بیگم سلمیٰ وجاہت علی اور بیگم کشور النسا، منصور قریشی، چودھری کبیر حسین، فرمان اور صاحت کے کردار بھی موجود ہیں جو اس کہانی کی تار و پود میں اپنا وجود تسلیم کراتے نظر آتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار مخدوم ناظر حیات ہے جس کا تعلق جاگردار طبقے کے علاوہ سیاست سے بھی جوڑا ہوا ہے۔مخدوم ناظر حیات جنسی عیاشی کا اس قدر شوقین ہے کہ ہر وقت وہ حسیناؤں کی قربت میں رہتا ہے۔مخدوم ناظر حیات کو سیاست بھی جاگیر کی طرح ورثے میں ملی ہوتی ہے۔وہ سیاست کے ذریعے عورت ذات کو استعمال کرتا ہے۔مخدوم ناظر حیات کی دو شادیاں ہوتی ہیں یہ دونوں اس کی پسند کی نہیں بلکہ سماجی اور سیاسی مفادات کی مرہون منت ہوتی ہیں۔پہلی شادی جو کشور النسا سے ہوتی ہے وہ مخدوم ناظر حیات اپنے بھائی کے قاتلوں سے راضی نامے میں ان کی بہن سے کرتا ہے۔اور دوسری جو سلمیٰ وجاہت سے ہوتی ہے وہ سیاسی مفاد کی غرض سے کرتا ہے۔خوبرو عورتوں سے تال میل اس کا مشغلہ ہوتا ہے، درجنوں خواتین سے خط اٹھاتے اٹھاتے جب اس کی نائلہ پر نگاہ پڑتی ہے تو وہ اسکا دیوانہ بن جاتا ہے اور اسے بستر پر لانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔نائلہ اس کے پاس آتی ہے مگر ایک سیاسی طوائف کی صورت میں کچھ عرصہ کے لیے اور پھر بعد میں مخدوم ناظر حیات کے قتل کی غرض سے اسکے پاس آتی ہے۔

مخدوم ناظر حیات حسیناؤں کے حصار میں رہنے کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے اور اپنے اس شوق کی تکمیل اور ہر قسم کے مفادات کی خاطر سیاست سے جڑے رہتا ہے۔ حسین عورتوں سے قربت کے کھیل میں ایک وقت ایسا بھی آجا تا ہے کہ مخدوم ناظر حیات مردانگی کا جوہر دکھانے کے لیے انجکشن لگاتا پھرتا ہے مگر اپنے اس شوق سے باز نہیں آتا ہے۔ بقول ناول نگار:

> "مخدوم ناظر حیات کی زندگی دو پٹڑیوں پر برابر بھاگتی چلی آرہی تھی۔ یہ پٹڑیاں تھیں عورت اور سیاست۔ عورت اول اور سیاست ثانی۔ عورت لازم اور سیاست ثانوی۔ اس کی سیاست محض قومی اسمبلی کی ممبری کے طواف کا نام تھا کہ جس کے سبب اسے باکمال خواتین تک رسائی، سماجی طور پر رعب اور دبدبے کے علاوہ محفوظ و مامون مقام بھی حاصل رہتا۔ مخدوم ناظر حیات ملکی سیاست کے ان چند سدا بہار منتخب (electable) شخصیات میں سے تھا کہ جن کی ضرورت ہر سیاسی جماعت کو رہتی ہے۔ وہ اکثر آزاد امیدوار کے طور رانتخابات کے میدان میں اترتا اور منتخب ہو کر اپنا لایا لگایا ایک طرف کرنے کے بعد اسی جماعت میں شامل ہو جاتا جو حکومت بنا رہی ہوتی۔"[15]

جب مخدوم ناظر حیات سرنکا میں حسیناؤں کی طلب میں سرگرداں پھر رہا ہوتا ہے، تب اس کی دوسری بیوی سلمی وجاہت اور پہلی بیوی کا بیٹا ہادی حیات اسے اپنے راستے سے ہٹا کر سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ صباحت اور فرمان سے مدد لینے کے ساتھ ساتھ نائلہ کو بھی مخدوم ناظر حیات کے قتل کے لیے سرنکا بھیج دیتے ہیں۔ سرنکا میں نائلہ کو ایک غیر ملکی سریندر مخدوم ناظر حیات کے قتل پر بہت مجبور کرتا ہے مگر نائلہ جب ایسا کچھ نہیں کرتی تو وہ اسے اغوا کر کے کہیں لے جا رہا ہوتا ہے کہ اس کی گاڑی کا تعاقب کرتے ہوئے صباحت اور فرمان سڑک حادثے میں مر جاتے ہیں۔

مخدوم ناظر حیات سے اس کا بیٹا اس لیے ناراض ہوتا ہے کہ مخدوم ناظر نے اس کی ماں کشور النسا سے بے وفائی کرتا ہے اور بیگم سلمی وجاہت علی سے دوسری شادی کر لیتا ہے۔ اس لیے ہادی حیات اپنے باپ کا قتل کروانا چاہتا ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد وہ خود سیاسی لیڈر بن کر اقتدار حاصل کر لے گا۔ بیگم سلمی وجاہت علی سیاسی اقتدار کی خاطر اور اپنے والدین کے حریف سے بدلہ لینے کے لیے شوہر کا قتل کروانا چاہتی ہے۔ سلمی وجاہت سے مخدوم ناظر حیات نے جس حال میں شادی کی اس کی کہانی کچھ یوں ہے۔ سلمی وجاہت علی کے والد اور مخدوم ناظر حیات ایک دوسرے کے سیاسی مخالفین ہوتے ہیں۔ جب سلمی وجاہت علی کے والد وجاہت علی انتقال کر جاتے ہیں تو سلمی وجاہت علی اپنے حلقے میں سیاسی حیثیت حاصل کرنے کے لیے پریشان ہوتی ہے اور ادھر مخدوم ناظر حیات اپنی حیثیت

کے لیے فکر مند ہوتا ہے۔اسی اثنا میں مخدوم ناظر حیات یہ حکمت عملی اپناتا ہے کہ سلمی وجاہت علی سے شادی کر اپنی سیاسی حیثیت بحال کر لیتا ہے۔ بیگم سلمی وجاہت علی کچھ عرصہ میں اس کی برائے نام مردانگی اور خوبرو عورتوں کی قربت کے نشے سے دل برداشتہ ہو کر علاحدگی اختیار کر لیتی ہے۔

جب مخدوم ناظر حیات منصور قریشی کے کہنے پر وطن واپس آتا ہے تو یہاں پر ایک نئی جال میں پھنس جاتا ہے۔اسے کہا جاتا ہے کہ بادشاہ لوگ اسے وزیر اعظم بنانا چاہتے ہیں۔اس لیے ان کے ہر حکیم منانا پڑے گا۔ مخدوم ناظر حیات کو یہ بات پسند نہیں آتی وہ خود کو گھر میں قید کر لیتا ہے۔اس دوران مخدوم کی منشا اور مرضی کے خلاف اس کی طرف سے حکومت کے خلاف ایک فارڈبلاک بنایا جاتا ہے جس میں موجودہ وزیر اعظم سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔اس طرح کچھ دن بعد مخدوم ناظر حیات کو زخمی حالت میں کسی سڑک کنارے پھینک دیا جاتا ہے۔اسی طرح سے عوام اور اپوزیشن کی ہمدردیاں مخدوم ناظر حیات کو حاصل ہو جاتی ہیں۔اس صورت حال میں اپوزیشن لیڈر چودھری کبیر حسین فائدہ اٹھانے کی فکر میں مخدوم ناظر حیات کے بیٹے ہادی حیات کو اپنا ہمنوا بنالیتا ہے۔ مخدوم ناظر حیات آخر کار اپنے بیٹے کے ساتھ حکومت مخالف دھرنے میں دھماکے میں مارا جاتا ہے اور اسی صورت کا فائدہ اٹھا کر بیگم سلمی وجاہت وزیر اعظم بن جاتی ہے۔

اس ناول میں مخدوم ناظر حیات کے پس پردہ ناول نگار نے وطن عزیز میں موجود سیاست اور سیاست دان کی عکاسی کی ہے۔ مخدوم ناظر حیات کے کردار کے ذریعے حکومتیں بنانے والوں کی کارکردگی بھی پیش کی ہے کہ کس طرح ہمارے ملک میں لوگ وزیر اعظم بنتے ہیں اور کس طرح ان کو پھر ہٹایا جاتا ہے۔کیسے جھوٹی خبریں پھیلائی جاتی ہیں اور کس طرح صحافیوں اور عورت ذات کو استعمال کیا جاتا ہے۔کیسے ملک کے اندار خود کش دھماکے کرا کر عوام کو دہشت گردی کے نام پر مارا جاتا ہے۔ کس طرح بیوی کو اپنے شوہر اور بیٹے کو باپ کا دشمن بنادیا جاتا ہے۔ مخدوم ناظر حیات جیسے لوگوں کو یہ علم بھی نہیں ہوتا ہے کہ وہ کس طرح الیکشن میں کامیاب ہوئے ہیں اور کیوں ان کو وزیر اعظم بنایا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں مخدوم ناظر حیات بے خبری کی سولی پڑ لٹکتے لٹکتے "تنگ آمد بہ جنگ آمد" کے مصداق منصور قریشی اور نائلہ سے کہتا ہے۔

> "کیا وزیر اعظم ایسے بنتے ہیں کہ جیسے میں بنایا جارہا ہوں۔ میں تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ کون لوگ ہیں جو مجھے یہاں گھسیٹتے پھر رہے ہیں۔ میرے سامنے تو آپ دونوں کے چہرے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ پھر ہاتھ جوڑتا ہوں یہ اپریل فول بند کریں اور مجھے جانے دیں۔ چاہیں تو یہ فارم ہاؤس بھی میں آپ کو دان کرتا ہوں۔"16

اس کے جواب میں منصور قریشی کہتا ہے۔

"مخدوم صاحب! آپ ریاست اور سیاست کو تو اچھی طرح سمجھتے ہیں ناں! ریاست ہو تو سیاست ہوتی ہے، ایک حکومت جاتی ہے تو دوسری آتی ہے۔ یہ کہیں نہیں ہوتا کہ اپنی سیاست اور اقتدار بچانے کے لیے ریاست ہی قربان کر دی جائے۔ ریاست کا وجود مستقل اور سیاست چل چلاؤ۔ ریاست اپنے مستقل اداروں سے استقامت پاتی ہے۔ انتظامیہ، عدلیہ اور فوج ریاست کی نگہبانی کرتے ہیں۔ انتظامیہ یا نوکر شاہی ریاست کے استحکام اور اس کے تحفظ کو یقینی بناتے ہوئے بدلتی ہوئی حکومتوں کے درمیان اقتدار کی منتقلی میں نہایت غیر جانبداری سے سہولت کاری کے فرائض سر انجام دیتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کیا ہوا؟ ہمارے ہاں تو اہلِ سیاست نے انتظامیہ جیسے ریاست کا وفادار ہونا چاہیے تھا، سیاستدانوں کی وفادار ہو کر ریاست کی جڑیں کھوکھلی کرنے لگی۔ ایسے میں جو خلا نوکر شاہی یا انتظامیہ پیدا کرتی ہے اسے پر کرنے کے واسطے دوسرے ادارے حرکت میں نہ آئیں تو کیا خاموشی سے ایک طرف بیٹھ کر ریاست ٹوٹنے کا نظارہ کرتے رہیں؟"[17]

منصور قریشی کے اس جواب نے ملک کی سیاسی، انتظامی اور دیگر اداروں کی کارکردگی کو سامنے رکھ دیا ہے۔ کس طرح ہمارے ملک میں مقتدر قوتیں خود کو قائم رکھنے اور ملک کے نظام کو چلانے کے لیے کیسے کیسے الجھاؤں میں گم ہیں، مخدوم ناظر حیات کو وزیر اعظم بنائے جانے کی کوششوں سے سب کچھ سامنے ہے۔ منصور قریشی جو صحافی کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ مخدوم ناظر حیات کو حکومت کی تشکیل کے بارے میں یہ بات بھی سمجھتا ہے کہ

"عالمی جنگوں کے ذریعے دنیا کے نقشے بدلنے کا زمانہ جا چکا اور وہ زمانہ بھی قصہ ماضی ہوا کہ جب باہمی یا پراکسی جنگوں سے ملکوں پر قابضے کیے جاتے تھے۔ ہمارا زمانہ اب ڈیپ سٹیٹ (DEEP STATE) تھیوری کی توسیع کا زمانہ ہے۔ ڈیپ سٹیٹ میں اپنے ہی ملک کی ایجنسیاں کوئی کاٹھ کا لگڑ بگڑ کرسی پر بٹھا کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتی تھیں لیکن اب تو دشمن ملکوں کی خفی ایجنسیوں کے ساتھ ساتھ دوست ممالک اور ان ظاہر و خفیہ ادارے اپنے ہی دوست ملکوں پر اپنی مرضی کی معاشی، سیاسی اور تجارتی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے حکومتیں بناتے اور توڑتے ہیں۔"[18]

اس ناول کا ایک اور اہم کردار نائلہ نامی ایک لڑکی ہے جو سیاسی طوائف کی نمائندگی کرتی ہے۔ نائلہ چند برس کی ہوتی ہے کہ اس کا والد دوسری شادی کر کے نائلہ اور اس کی ماں کو گھر سے بے دخل کر دیتا ہے۔ نائلہ اور اس کی ماں بے یار و مددگار ہونے کے سبب بھائی کے گھر (نائلہ کے ماموں کے گھر) آجاتے ہیں۔ نائلہ کی ماں اپنے بھائی کے گھر میں ایک کام والی کی حیثیت سے زندگی کے شب و روز گزار رہی ہوتی ہے۔ جب نائلہ کچھ بڑی ہوتی ہے تو ماموں کے ہاتھوں جنسی تشدد کا شکار ہو جاتی ہے۔ نائلہ کو ماموں کی درندگی کا سامنے کرنے کے بعد حالات سے سمجھوتہ کرتے کرتے یہ احساس ہو گیا کہ انسانی زندگی میں روپے اور رسوخ کی کتنی اہمیت ہے۔ اسی طرح کچھ مزید برس ماموں کی کفالت میں اس شعور کی پختگی کے حصول کے میں گزر دیتی ہے۔ نائلہ نے ماموں کی شیطانیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر کا سارا نظام اپنے ہاتھ میں کر لیا اور پھر اپنی تعلیم بھی میٹرک تک مکمل کی۔ اس دران نائلہ ان اسرار و رموز سے بھی آشنائی حاصل کرتی رہی کہ کس طرح ایک عورت مرد کو اپنے قابو میں رکھ سکتی ہے۔

> "نائلہ نے سرنڈر کی آڑ میں جہاں گھر بھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے کر باقی سب کو ثانوی کر دیا وہیں ماموں کی حیوانیت کو بھی اس طرح نکیل ڈالی کہ اپنی مرضی کا مطیع کر لیا۔ اس کے سامنے اب ایک اور ٹارگٹ اپنی میٹرک تک تعلیم کا مکمل کرنا اور دوسرا اپنی چھوٹی بہن کو کسی نہ کسی طرح ماموں کی ہوس خیزی سے بچا کر رکھنا تھا۔ سو ان معاملات میں کامیاب رہی۔ وہ اس انکل سے آشنا ہو چکی تھی کہ جس کے ذریعے عورت، مرد جیسی مخلوق کو نکیل نہ ہوتے ہوئے بھی نکیل ڈالے رہتی ہے۔ جس عمر میں لڑکیاں کاغذ کی کشتیوں سے کھیلتی ہیں، نائلہ اس عمر میں اپنے ماموں جیسے مردوں کی وحشیانہ جبلت اور جسمانی تو سیع پسندی کو اپنی حدود کے اندر رکھنے کی قدرت حاصل کر چکی تھی مردانگی کے حوالے سے اپنی اب تک کی زندگی میں نائلہ نے ویسے بھی اپنے باپ اور ماموں کو دیکھا اور بھگتا تھا۔ اس لیے اگر اس کا کا زوایہ نگاہ صرف ان دو مردوں تک محدود تھا تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ دنیا کے تمام مرد اب اسے اگر اپنے ماموں یا باپ جیسے دکھائی دیتے تو اس میں ایسا غیر فطری کیا تھا۔"[19]

بچپن میں ماموں سے جنسی تشدد کا شکار ہونے والی نائلہ بڑی ہو کر سیاسی طوائف بن جاتی ہے اور اپنے کام میں اس قدر ماہر ہوتی ہے کہ اس کو ملکی و غیر ملکی ایجنسیاں ممبر شپ دے دیتی ہیں۔ ایسی ایجنسیوں کی ممبر بن جاتی ہے جن کا کھیل دنیا بھر میں حکومتیں بنانا اور گرانا ہوتا ہے۔

"قبل از دوشیزگی اپنے پامال جسم سے بہنے والے لہو سے ہلکان لڑکی طاقت کا کھیل کھیلنے والے بکھیاڑوں کی قتل گاہوں سے ہوتی ہوئی، اقتدار کی غلام گردشوں سے سند یاب ہو کر سیاست و سیادت کی ان منزلوں تک آن پہنچی تھی کہ جہاں محسنوں کی جان لینا اور اپنی زندگی کو ہر دم داؤ پر لگائے رکھنا ہنر سے زیادہ بے وفائیوں کا مرہون منت سمجھا جاتا تھا۔ اس کی نم آلود بند آنکھوں کے سامنے کئی سر بریدہ لاشیں گزرتی چلی گیئں کہ جو اسے فریب دینے کی کوشش میں خود اس کے چلتروں کی تیغ تلے کہیں اپنی گردنوں اور کہیں اپنی توقیر سے محروم ہوتی رہی تھیں۔ اسے وفاؤں کے رنگوں سے بے وفائی کی ہولی کھیلنا آیا تو مفادات کی لغت میں مہر و وفا کے معنی بدلتے چلے گئے۔"40

نائلہ نے جس ماحول اور جن حالات میں پرورش پائی تھی اسی کے اثر سے وہ ایک "سیاسی طوائف" بن کر سامنے آتی ہے۔ اس لیے وہ ایوانِ اقتدار کی راہداریوں تک جا پہنچتی ہے اور حکومتیں بنانے، گرانے کے لیے بطور مہرے کے استعمال ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح مخدوم ناظر حیات اس سے اپنی ناکام آرزوؤں کی تکمیل کے لیے دھوکہ کھاتا رہتا ہے۔

یہاں نائلہ کے کردار کے ذریعے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ اقتدار کی جنگ میں انسانیت اور دیگر انسانی تعلقات کی بجائے صرف اور صرف مفاد کا حصول اہم ہوتا ہے۔ اسی طرح عورت ذات کو انسان کی بجائے ایک جنس سمجھ کر کہاں کہاں استعمال کیا جاتا ہے۔ نائلہ جیسے کردار ہمارے سماج میں کثرت سے موجود ہیں جن کو دیکھ کر ہمیں کھن تو آتی مگر ہم اس قدر اخلاقی طور پر گر چکے ہیں کہ ہم اپنی بچیوں سے جنسی تشدد کر کے سماج کی تباہی کا سبب بن رہیں۔ اس صورت میں حیا پرور نہیں طوائفیں ہی پروان چڑھا کرتی ہیں چاہے وہ کسی انتقامی جذبے کی تسکین کے لے ہو یا پھر کسی انسانی ضرورت کی تکمیل کے لے ہو۔ نائلہ کا کردار ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ معاشرے میں موجود جنسی بے راہ روی کا شکار عورتیں کس ماحول میں پیدا ہوتی ہیں اور کس طرح پروان چڑھتی ہیں اور کیونکہ غلط راہ اختیار کرتی ہیں۔ نائلہ کے کردار سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہماری بچیوں کے حفاظت کے لیے کوئی رشتہ اب قابل اعتبار نہیں رہا ہے۔ اس لیے اپنی بچیوں کو قریبی رشتوں سے دور رکھا جائے تاکہ کوئی نائلہ نہ بن سکے۔

ان ناولوں کے تجزیہ سے بات سامنے آتی ہے کہ محمد حفیظ سماج کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ سماج میں رائج خیر و شر کے پیمانوں کو سمجھتے ہیں اور پھر اپنا نکتہ ء نظر سامنے لانے کی بجائے اُن برائیوں اور خرابیوں کو نشان زد کرتے ہیں جو سماجی قدروں کی تباہی کا سبب بن رہی ہیں۔ وہ کسی طرح کا تعصب ہو، ہوس ہو یا سماجی جبر ہو، محمد حفیظ ہر صورت کو جانتے ہیں اور اسے قاری کے سامنے آشکار کرتے چلے جاتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ حفیظ خان، محمد۔انو اسی، جہلم: بک کارنر پاکستان، 2019ء ص13۔

2۔ ایضاً، ص15،14۔

3۔ ایضاً، ص17۔

4۔ ایضاً، ص36۔

5۔ زین العابدین۔ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض اقتصادی اور مالی پہلو، دہلی: مکتبہ جامعہ، 1939ء، ص41۔

6۔ غلام اصغر خان۔نظریہ قومیت:عالمی و مقامی تناظر، لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2022، ص191۔

7۔ حفیظ خان، محمد۔انو اسی، جہلم: بک کارنر پاکستان، 2019ء ص20۔

8۔ ایضاً، ص123۔

9۔ ایضاً، ص241۔

10۔ ایضاً، ص181۔

11۔ ایضاً، ص182۔

12۔ ایضاً، ص237۔

13۔ ایضاً، ص125

14۔ ایضاً، ص242۔

15۔ حفیظ خان، محمد۔منتارا، لاہور، راولپنڈی: صریر پبلیکیشنز، 2021، ص154۔

16۔ ایضاً، ص189۔

17۔ ایضاً، ص189

18۔ ایضاً، ص190۔

19۔ ایضاً، ص89۔

20۔ ایضاً، ص128۔

باب چہارم:

محمد حفیظ کے ناولوں میں سماجی شعور اور فنی جائزہ

سماج کیا ہے؟

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اکیلا کبھی نہیں رہ سکتا بلکہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر اپنی زندگی گزرتا ہے۔ انسان میں انسانی خصائص اور خصلتیں معاشرے میں رہ کر ہی پیدا ہوتی ہیں۔ تقریباً تمام ماہرین سماجیات کا کہنا ہے کہ انسان اور سماج کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ کیونکہ انسان سماج کے بغیر نامکمل ہے اور اس کی شخصیت دوسرے لوگوں کے ساتھ رہ کر تعمیر ہوتی ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سماج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ سماج گروہی زندگی کا نام ہے۔

سماج سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی اکٹھا رہنے کے ہیں۔ اردو زبان میں معاشرہ کا لفظ مستعمل ہے اور انگریزی میں سوسائٹی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لفظ سوسائٹی (society) کے معنی ویبسٹر زنیو انگلش ڈکشنری میں یہ ہیں:

> Human being in Genral taken in relation to one another: an organized community: a body of persons united for some of person united for some common purpose: the more cultivated or more fashionable part of the community. [1]
>
> A Society is a grouping of individuals, which is characterized by common interest and may have distinctive culture and institutions, "Society" may refer to a particular people, such as the Nuer, to a nation state, such as Austia, or to a broader cultural group, such as western Society, Society can also be explained as an organized group of people associated together for religious, benevolent, cultural scientific political, partriotic, or other purposes.[2]

معاشرہ، سماج یا سوسائٹی اس گروہ کا نام ہے جس میں انسان ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ انسان باہمی تعلق و تعامل کے اعتبار سے انفرادی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اس میں اقدار حیات اور ثقافت و تہذیب کے ساتھ ساتھ ذہنی، نظریاتی اور روحانی اختصاص اس طور پر پائے جاتے ہیں جو اسے دوسرے گروہوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ نیز احساساتی وجذباتی اور شعوری و غیر شعوری طور پر اس کی کڑیاں مضبوط ہوں۔

سماجیات کے بانی اگست کونٹ کو مانا جاتا ہے۔ 1839ء میں سب سے پہلے اگست کونٹ نے ہی سماج کی اصطلاح کو استعمال کیا۔ اس بات کی وضاحت عائشہ بیگم اپنی کتاب "تاریخ اور سماجیات" میں اس طرح کرتی ہیں۔

"سماجیات دو الفظ کا مرکب ہے۔ پہلا SOCIETUS جو ایک لاطینی لفظ ہے جس کے معنی ہیں سماج یا گروہ۔ دوسرا لفظ LOGOS ہے۔ یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں مطالعہ یا علم۔۔۔۔ یعنی سماجیات وہ علم ہے جس میں سماج کے مختلف اجزا اور افراد کے بین عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔۔۔ ہر سماج ایک مکمل اور خود کار حقیقت ہوتا ہے اور جب تک مختلف شعبہ ہائے زندگی کا مربوط اور مجموعی جائزہ نہ لیا جائے اس وقت تک سماجی گتھیوں کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے سماج کو ایک علیحدہ علم کی ضرورت ہوتی ہے۔"[3]

اس طرح انسان کا وجود سماج کے لیے ضروری ہے۔ سماج کا تصور جانور، پرندے، پیڑ پودے اور ندی نالے کی موجودگی سے نہیں بنتا بلکہ انسانوں کے گروہ سے سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ انسان پہلے ہے یا سماج لیکن جو چیز سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان سماج کا پروڈکٹ ہے اور سماج کا تصور انسانی گروہ سے قائم ہے۔ انگلش کا ایک مشہور جملہ ہے۔ (Man is not born human but to be made human) اس کا مطلب ہے کہ آدمی انسان پیدا نہیں ہوتا بلکہ اسے بنایا جاتا ہے۔ یعنی کہ آدمی کو انسان سماج اور معاشرے میں پہلے سے موجود انسان اور ان کے عادات و اطوار ہی بناتے ہیں۔ ایک آدمی سے انسان بننے کا سفر آسان نہیں ہے۔ اسی حوالے سے غالب کا شعر ہے۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

انسان کو انسانی خصوصیات کا حامل ہونے کے لیے سماج میں سماجی اصولوں کے ماتحت رہنا ضروری ہوتا ہے۔ سماج میں رہ کر ہی انسان شعور کرتا ہے۔ ذہنی پختگی انسانوں کے درمیان رہ کر ہی ممکن ہے۔ انسان بننا ایک عمل ہے۔ یہ عمل ایک یا دو دن میں مکمل نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ سلسلہ آدمی کی آخری سانس تک چلتا ہے۔ کئی بار کی تحقیق اور مشاہدے کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایک انسان کے اندا انسانی خصوصیات اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتیں۔ جب تک وہ سماج میں انسانوں کے درمیان نہ رہے۔ ڈاکٹر ضیا الحسن کا سماج کی تشکیل کے حوالے یہ کہنا ہے۔

"ہر انسان کو اپنے کمال تک پہنچنے کے لیے بہت سی اشیا کی ضرورت پڑتی ہے اگر کوئی بھی انسان اپنی فطرت طبیعی کا اقتضا کرنا چاہتا ہے تو اسے دوسرے افراد کی ضرورت پڑے گی۔ گروہ مختلف افراد سے مل کر بنتا ہے۔ گروہی زندگی ہی فرد کو اپنی ذات کی تشکیل کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کے بغیر کوئی انسان اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔"[4]

ابوالاعجاز صدیقی سماج کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

"سماجی تعلقات کا وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے۔ سماجی تعلقات کا یہ نظام باالفاظ دیگر ہمارا سماجی ماحول ہمارا اوہام و عقائد، افکار و تصورات، ہمارے فلسفہ حیات اور ہمارے کردار کی تشکیل و تعمیر میں بہت حد تک دخیل ہوتا ہے۔"[5]

دوسروں سے تعلقات رکھنا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ ان تعلقات کی وجہ سے وہ قصبے، گاؤں اور شہر آباد کرتا ہے۔ انسان کے لیے قبیلہ، خاندان اور قوم اہم عناصر تصور کیے جاتے ہیں۔ اس میں ماں باپ، بہن بھائی، عزیز و اقارب اور اس سے بڑھ کر رسم و رواج، تاریخ، سیاست اور معیشت پر مشتمل ہیں۔

علامہ ابن خلدون اپنے "نظریہ العصبیہ" لکھتے ہیں کہ انسان انفرادی طور پر زندگی نہیں گزار سکتا کیونکہ جب وہ اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو سب سے پہلے اپنے ارد گرد ماں باپ اور بہن بھائیوں کو دیکھتا ہے۔ جن سے اس کو فطری محبت ہوتی ہے۔ اس طرح جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اپنے خاندان، قبیلے اور معاشرے کے لوگوں سے اس کا تعلق جڑ جاتا ہے۔ جس میں اس کے نسلی، مذہبی اور لسانی گروہ کے افراد شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اجتماعی یا معاشرتی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے گروہ سے الگ ہوتا ہے تو وہ پھر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ معاشرتی زندگی میں ہر آدمی باہمی شراکت اور معاشرتی نظم و ضبط کا پابند ہوتا ہے۔ یعنی سماج کے علاوہ انسان اپنا وجود قیام نہیں رکھ پاتا ہے اس لیے ابن خلدون گروہی زندگی کی بات کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں کہ جس قبیلے یا خاندان میں عصبیت زیادہ قوی ہو گی وہ حکیمرانی کرے گا اور جس میں عصبیت کم ہو گی یا نہیں ہو گی تو وہ قبیلہ یا خاندان مٹ جائے گا۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سماج کے بغیر انسان بے معنی ہوتا ہے۔ سماج انسان کو بے شمار طریقوں سے متاثر کرتا ہے اور جوں جوں معاشرے کی تہذیب و ثقافت میں تبدیلی رونما ہوتی ہے توں توں سماج بھی تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ جس طرح سماج یا معاشرے کے بغیر انسان کی کوئی قدر نہیں ہوتی اسی طرح انسان کے بغیر معاشرے کا کوئی ڈھانچہ نہیں ہوتا ہے۔ انسانی رویے، رجحانات ہی معاشرے میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔

شعور کیا ہے؟

ہر شخص مختلف ہے اور ہر شخص کا شعور بھی دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ہم تمام لوگوں کے دماغ کو مکمل طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ سماجی شعور کہلاتا ہے۔ مذہبی، سیاسی، اخلاقی، اقتصادی، قانونی اور سائنسی شعور یہ سب سماجی شعور کے اجزاء تصور کیے جاتے ہیں۔

شعور عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی عقل، سلیقہ، پہچان، تمیز اور آگاہی وغیرہ کے ہیں۔ انگلش میں اس کو Awarness کہتے ہیں۔ سماجی شعور، معاشرتی آگاہی اور پہچان سے عبارت ہے۔ یہاں وہ تغیر اہم ہے جو ہر وقت معاشرے میں جاری رہے اور زندگی کے نئے رخ متعین کرے۔ معاشرے کے عمومی و خصوصی رویے منفی اور مثبت سطح پر اس کے انفرادی زاویوں سے پہچان بھی سماجی شعور کے دائرے میں آتی ہے۔ ڈاکٹر کامران کاظمی اپنی کتاب "اردو ناول اور عصریت" میں لکھتے ہیں۔

> "شعور اشیا کے وقوف کا نام ہوتا ہے۔ وہی اشیا واضح اور غیر مبہم ہوں گی جو شعور کے روبرو ہوں گی۔ فرائڈ کے شعور کے تصورات کے مطابق شعور ہماری صلاحیت کا معمولی حصہ ہے بڑا حصہ تو لاشعور ہے۔ گویا وہ اشیا جو شعور سے قدرے فاصلے پر ہوں گی وہ ھندلی ہوتی جائیں گی اور زیادہ دوری ان اشیا کی ماہیت کو کمزور کر دے گی۔ یہ عمل سماج میں بھی جاری رہتا ہے۔ تمام ماضی سماجی عمل کے حال میں جمع نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے دھندلے نقوش موجود ہوتے ہیں یا سماجی عمل ان میں کوئی ارتقائی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ فرد جس قدر سماج پر اثر انداز ہوتا ہے سماج بھی فرد پر ایسے ہی یا زیادہ اثرات مرتب کرتا ہے۔ انفرادیت پند فرد کی حیثیت کو سماجی عمل کے مکمل تابع کر دیتے ہیں جس سے فرد کی انفرادیت تحلیل ہو جاتی ہے۔"[6]

اس طرح سعید احمد رفیق سماجی شعور کے بارے میں لکھتے ہیں

> "نہ انفرادیت پسندوں کی طرح سماجی شعور کے وجود سے انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ اجتماعیت پسندوں کی طرح سماجی شعور کے معنی سماج کا بلاواسطہ شعور حاصل کرنے کے لیے جا سکتے ہیں۔ سماجی شعور کا مطلب ہے انفرادی شعور اور خارجی حقائق میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش، انفرادی تجربات کا رشتہ ماحول اور خارجی دنیا سے پیدا کرنے سے سماجی شعور وجود میں آتا ہے۔ اپنے تجربات اور ان کے تاثرات میں کھو کر رہ جانا انفرادیت ہے لیکن ان تجربات اور تاثرات کا سماج سے رشتہ تلاش کرنے کی کوشش سماجی شعور پیدا کرتی ہے۔"[7]

سماج کا سب حساس تریں شخص ادیب ہوتا ہے۔ جس کی سماج پر بہت گہری نظر ہوتی ہے۔ وہ معاشرے میں پیدا ہونے والے ناسوروں کے خلاف اپنے قلم سے آپریشن کرتا ہے۔ یہ وہ ہی ادیب کر سکتا ہے جو سماج کے ارتقا کا شعور

بھی رکھتا ہو۔ تاریخ شعور کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کی درست تصویر بنانے کے لیے معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے ساتھ ساتھ نچلے طبقے کے افراد، کسانوں اور مزدوروں کے صحیح حالات ان کے روزمرہ کے مسائل کی نشاندہی کی جائے اور بہتر معاشرے کی تعمیر کے لیے ان کے روزمرہ کے مسائل کا قابل قبول حل بھی پیش کیا جائے۔

محمد حفیظ سماجی شعور رکھنے والے حساس ادیب ہیں۔ ان کی کہانیاں کی معاشرتی زندگی کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ ان کی فکر میں انسانیت کا درد نظر آتا ہے۔ وہ حقیقی اور سچے حالات کی مکمل بصیرت رکھتے ہیں۔ ان کے فکر و شعور میں انسان دوستی اور آزادی کا تصور ملتا ہے اور ان کی تمام تحقیقات میں مقصدیت کا روشن پہلا ملتا ہے۔ جن میں احترام آدمیت اور حرمت انسانیت کا جذبہ بھی کار فرما ہے۔ یہی ان کا نظریاتی پس منظر ہے۔

محمد حفیظ نے اردو اور سرائیکی دونوں زبانوں میں ناول لکھے ہیں۔ ان کا پہلا ناول "ادھ ادھورے لوک" جو 2018ء میں اگرچہ بیک وقت سرائیکی اور اردو میں لکھا مگر اس کا سرائیکی ورژن اردو سے پہلے شائع ہوا۔ ادھ ادھورے لوگ، انواسی، کرک ناتھ اور منتارہ ان کے ایسے ناول ہیں جو انھیں ادب کی دنیا میں تادیر زندہ رکھیں گے۔ انواسی اور ادھ ادھورے لوگ تاریخی ناول ہیں، جن میں سرائیکی خطے کے مسائل و معاملات کو ادب کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ان دو ناولوں میں محمد حفیظ نے اردو زبان میں سرائیکی الفاظ کو اس طرح برتا ہے کہ وہ اردو زبان کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ کرک ناتھ اور منتارہ موجودہ دور کی اشرافیہ کی زندگی اور ان کے سیاہ کارناموں کے عکاس ہیں۔

محمد حفیظ نے تاریخی کرداروں کو جس کمالِ ہنروری سے ادب کا حصہ بنایا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ تاریخ کے بیان میں تاریخیت سے دامن بچالے جانا بہت مشکل کام ہے اور محمد حفیظ یہ کام کر گزرے ہیں تو ستائش ان کا حق ہے اور بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے انھیں یہ حق دیا ہے۔ مشہور فکشن نگار حامد سراج لکھتے ہیں:

> "حفیظ خان نے "انواسی" ایسا شاندار ناول لکھا ہے جو کسی ایک صدی میں قید نہیں، آنے والے وقتوں میں بھی اس کی گونج سنائی دیتی رہے گی۔"[8]

اسی طرح خالد فتح محمد لکھتے ہیں:

> "انواسی" حفیظ خان کا ایک تاریخ ساز ناول جس میں خطے کی تاریخ اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو کمالِ ہنروری کے ساتھ پیش کیا ہے۔"[9]

محمد حفیظ نے تمام ناولوں میں اسلوب بیانیہ ہی رکھا ہے اور تکنیک کی اس یک رنگی کے علاوہ ناولوں میں محروم طبقات کی نمائندگی، استحصالی قوتوں کے ذریعے سے، ظلم کی چکی میں پستی عوام اور خواتین کی بے بسی اور ان کی معاشرتی حیثیت کی

صدیوں سے ہوتی ہوئی پامالی ان کے ناولوں میں مشترک عناصر ہیں۔ محمد حفیظ کی ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ ان کے ناولوں میں عورت کی نفسیات کے حوالے سے اپنے مطالعے کو جس طرح بیان کیا ہے، وہ ان کا اختصاص نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ارشد چہال لکھتے ہیں:

> "عورت کی فطری اور جسمانی خواہشات کو جس انداز میں حفیظ خان نے پیش کیا ہے، یہ انداز بڑے ناولوں میں بھی کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ عورت کے جسمانی تقاضوں کو اخلاقیات اور مذہبی پابندیوں سے بالاتر ہو کر دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ فرائیڈ کے نظریات کے اس قدر قریب چلے جاتے ہیں کہ ان کے نسوانی مطالعے کی داد دینا پڑتی ہے۔"[10]

ادھ ادھورے لوگ

محمد حفیظ کا یہ ناول اردو اور سرائیکی بیک وقت دونوں زبانوں میں شائع ہوا ہے۔ اس ناول میں ریاست بہاول پور کے سماج کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح ایک خوشحال ریاست کے برصغیر کی تقسیم سے حالات خراب ہوئے اور بہاول پور کیسے ون یونٹ کی زد میں آیا، ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد بہاول پور کو صوبے کی حیثیت دینے کی بجائے اس کو صوبہ پنجاب میں ضم کر دیا گیا۔ اس لیے بہاول پور کے لوگ اپنی شناخت کی بحالی کے لیے خاک بسر ہو گئے۔

ریاست بہاول پور ہندوستان کی سب سے بڑی اور خوشحال ریاست سمجھی جاتی تھی۔ اس ریاست میں مسلم و غیر مسلم سبھی ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ کسی کو کسی چیز کا ڈر نہیں تھا کیونکہ ریاست کے والی نے ریاست کے اندر امن وامان کا نظام قائم کر رکھا تھا۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم ہوتی ہے تو ریاست بہاول پور کا والی مسلم ہونے کی وجہ سے اور کچھ اپنے مفاد کی خاطر پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیتا ہے۔ پاکستان کے ساتھ الحاق ہوتے ہی ریاست کا امن وامان ہوا ہو جاتا ہے اور ہر چہرے پر خوف نظر آنے لگ جاتا ہے۔ برسوں کے دوست، پڑوسی اور محلے دار اب ایک دوسرے سے اپنی جان بچاتے پھر رہے ہوتے ہیں۔ پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا تھا اور اس کے بنانے والوں کا خیال بھی یہی تھا کہ یہاں اسلامی تعلیمات کے مطابق لوگ زندگی گزاریں گے لیکن یہاں تو پہلے دن سے ہی خود غرضی اور مفاد پرستی شروع ہو گئی۔ لوگوں نے مذہب، نسل اور زبان کی بنیاد پر ایک دوسرے کو لوٹنا شروع کر دیا، اخلاقی قدروں کی پامالی، غنڈہ گردی اور منفی سیاست نے معاشرے کو اس طرح لپیٹ میں لیا کہ خدا کی پناہ۔ اس

طرح ون یونٹ کا قیام جس سے پھیلی ہوئی تاریکی آج تک ختم نہیں ہو رہی ہے۔ ادھ ادھورے لوگ اسی صورت حال کا نوحہ ہے۔

ناول کا مرکزی کردار فیاض ہے جس کے ذریعے ناول نگار نے بہاول پور اور اس کے لوگوں کی سیاسی، سماجی اور نفسیاتی کشمکش کو موضوع بنایا ہے۔ فیاض کا والد نذیر حسین نواب آف بہاول پور کا باڈی گارڈ ہوتا ہے۔ جب فیاض میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوتا ہے تو اس کا باپ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا بھی اس کی طرح نواب صاحب کا باڈی گارڈ بنے۔ اس لیے نذیر حسین فیاض کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے لیکن چند دن بعد فیاض اپنے باپ کو انکار کر دیتا ہے کہ وہ نواب صاحب کا باڈی گارڈ نہیں بنے گا۔ نذیر حسین اسے ہنر مند بنانے کا سوچا تو فیاض نے پھر توجہ نہ دی۔ اس دوران فیاض بیمار ہو جاتا ہے اور والد اس کو حکیم رام لعل کے مطب پر لے جاتا ہے۔ فیاض حکیم کو لوگوں کا دوادارو کرتے دیکھتا ہے تو سوچ لیتا ہے کہ میں اس سے حکیمت سیکھ کر لوگوں کی خدمت کروں گا۔ جب فیاض بیماری سے صحت یاب ہوتا ہے تو اپنا ارادہ والد کو بتاتا ہے کہ میں حکیم رام لعل سے حکیمت سیکھنا چاہتا ہوں۔ باپ اس پر غصہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ تو اس ہندو حکیم کا شاگرد بنے گا تجھے شرم نہیں آئے گی۔ فیاض باپ کو جواب دیتا ہے کہ اگر ایک ہندو حکیم لوگوں کا دوادارو کر سکتا ہے تو اس سے کام سیکھنے میں کیا شرم۔ آخر کار وہ فیاض حکیم کے مطب پر کام سیکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ بہت جلد ہی اپنے کردار و عمل سے حکیم کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے۔ ناول نگار نے اس زمانے میں سماج میں پایا جانے والا مذہبی تعصب دکھایا ہے۔ یعنی حکیم سے فیاض کے والد کی نفرت ہندو مسلم جداگانہ مذہبی تشخص کا شاخسانہ نظر آتی ہے۔

حکیم رام لعل ناول کا ایک ایسا کردار ہے جو ڈیرہ نواب کے بازار میں اپنے مطب پر بے لوث انسانیت کی خدمت کرتا ہے۔ یعنی کہ فیس بغیر لوگوں کا دواداروں کرتا ہے جو کوئی جتنے روپے دے تو ٹھیک ورنہ وہ خود نہیں مانگتا۔ حکیم صاحب کا گھر احمد پور میں ہوتا ہے۔ جہاں وہ اپنی بیوی رادھی اور ایک بیٹی تلسی کے ساتھ زندگی کے دن گزار رہا ہوتا ہے۔ حکیم رام لعل جو اپنے کام کی وجہ سے پورے علاقے میں شہرت رکھتا ہے مگر اس سے اپنی بیوی بے نیاز ہوتی ہے اور وہ اپنے رشتے دار سوڈھی مل سے ناتا جوڑ لیتی ہے۔ یہ سوڈھی مل ایسا حرامی آدمی ہوتا جو حکیم کی بیوی کے ساتھ ساتھ اس کی بیٹی تلسی پر بھی نظر رکھنے لگ جاتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے وشنو کا رشتہ تلسی سے کرانا چاہتا ہے۔ وشنو جو عمر میں بھی تلسی سے کم ہوتا ہے اور احمق بھی ہوتا ہے۔ اس لیے تلسی کو نہ وشنو پسند ہے اور نا اس کا باپ سوڈھی مل جو ان کے گھر آتا تو اس کی ماں کے لیے ہے لیکن اس کی نظریں تلسی کے جسم میں سوئی کی طرح چھید کرتی ہیں۔ تلسی یہ دیکھ کر سوچتی ہے کہ جب گھر میں سوڈھی مل آتا ہے تو اس ماں کے چہرے پر غصے کی جگہ خوشی آجاتی ہے۔ تلسی یہ سوچنے لگتی ہے کہ یہ کیسی عورت ہے جو اپنے شوہر کے گھر آنے پر غصے سے بھر جاتی ہے اور شوہر کی غیر موجودگی میں کسی اور مرد کے گھر آنے پر خوش ہوتی اور اس کے ساتھ بیٹھ کر ہنستی مسکراتی رہتی ہے۔ ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ سوڈھی

مل کے ہوتے ہی حکیم صاحب بھی گھر آ جاتے ہیں اور تلسی خوش ہوتی ہے کہ آج اس کی ماں اپنے شوہر کے سامنے شرمندہ ہو گی لیکن ایسا نہیں ہوتا اور تلسی مزید حیران ہو جاتی ہے۔ حکیم صاحب سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی ناسوڈھی مل کو کچھ کہتا اور نا اپنی بیوی کو، وہ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ جب تلسی یہ سب دیکھ لیتی ہے تو اسے اپنے باپ سے بھی نفرت ہونے لگ جاتی ہے اور وہ سوچتی ہے کہ یہ کیسا مرد ہے جو اپنی بیوی کو کسی اور مرد کے ساتھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں کہتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا باپ اس کی ماں وہ سب نادے پاتا ہو جو وہ سوڈھی مل سے حاصل کر رہی ہے۔ اس لیے سوڈھی مل کے آنے پر ماں خوش ہو جاتی ہے اور ماپ کے آنے پر غصہ ہونے لگتی ہے۔ اس طرح تلسی کو مردوں سے نفرت ہونے لگ جاتی ہے۔

> "یہ کیسی منزل ہوتی ہے شادی شدہ زندگی میں کہ ایک دوسرے کے لیے مرنے مارنے والے، ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے، ایک دوسرے جان چھڑاتے پھر رہے ہوتے ہیں۔ نئی نئی شادی کے بعد ایک دوسرے کی پرچھائیں پر شک کرنے والے، شک تو کیا پک پر بھی توجہ نہیں کرتے ایسے کہ جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں، کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ دونوں کے ہاں جسمانی تقاضوں کو پورا کرنے کی خواہش نہ رہتی ہو گی، خواہش ہے تو چاچا سوڈھی آس پاس سب کو چھوڑ کر ہمارے گھر گھسا رہتا ہے۔ خواہش ہوتی ہو گی تبھی تو میرے ابا کو پیشانی پر بل ڈال کر چڑ چڑے انداز میں دیکھنے والی میری اماں ایک غیر شخص کو محض دیکھتے ہی کھلکھلا اٹھتی ہے، چہکنے لگتی ہے۔"[11]

ناول نگار محمد حفیظ یہاں پر ہمیں یہ بات واضح طور پر کہنا چاہتا ہے کہ ہمارے سماج میں حکیم رام لعل جیسے کئی ایسے افراد ہیں جو گھر سے باہر بڑی شہرت رکھتے ہیں مگر گھر میں اپنی بیوی کے سامنے خاک کے برابر ہیں۔ یعنی اپنی گھر والی کو وہ سکون نہیں دے پاتے جو انہیں چاہیے ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی عورتیں دوسرے مردوں کے ساتھ تعلق بنا لیتی ہیں۔ جیسا کہ ناول میں حکیم کی بیوی سوڈھی مل کے ساتھ رشتہ جوڑتی ہے۔

اس طرح سوڈھی مل جیسے کردار بھی ہمارے معاشرے میں ناسور کی طرح موجود ہیں۔ جو حرام حلال کی تمیز نہیں رکھتے۔ اس طرح کے کرداروں کی نشاندہی ہمارے سماج میں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کا سبب ہمارا سماجی ڈھانچہ ہے جہاں حرمت کے نام پر ایسے ناسوروں کو سامنے نہیں لایا جاتا مگر ایسے ناسور سماج میں پائے جاتے ہیں اور نشان دہی ادیب کی سماجی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمد حفیظ نے یہ ذمہ داری پوری کی ہے۔

فیاض جب ایک دن حکیم صاحب کے ساتھ اس کے گھر جاتا ہے تو تلسی کی نظر جیسے ہی فیاض پر پڑتی ہے تو اس کو فیاض سے محبت ہو جاتی ہے۔ تلسی فیاض کو دیکھنے کے بعد اکثر یہ سوچتی رہتی تھی کہ یہی وہ مرد ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ فیاض کو دیکھنے سے پہلے تلسی نے اپنی زندگی میں قریب سے صرف تین مردوں کو دیکھا ہوا تھا۔ ایک اس کا والد حکیم رام لعل، دوسرا اس کا منگیتر وشنو اور تیسرا اس کا ہونے والا سسر سوڈھی مل تھا۔ ان تینوں میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جو تلسی کو متاثر کر سکتی۔ لیکن ان کے مقابلے میں فیاض ایسا مرد تھا جس کو دیکھنے سے ہی نہیں بلکہ اس کے بارے میں سوچ کر بھی تلسی کے بدن میں مستی کی لہریں ہچکولے لینے لگتیں اور مسام مسام پسینے میں شرابور ہو جاتا تھا۔ تلسی اس لیے اپنا دل فیاض کو دے بیٹھتی ہے مگر ملاپ کی کوئی صورت نظر نہ آنے پر تلسی کی شادی سے کچھ دن پہلے جب اس کے والدین اپنے کسی قریبی رشتہ دار کی فوتگی پر دوسرے شہر جاتے ہیں اور فیاض کو محافظت کے لیے اپنے گھر ٹھہرا جاتے ہیں تو تلسی موقع پا کر اپنا آپ فیاض کے حوالے کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن فیاض اس سے محبت کرنے کے باوجود اسے اس حالات قبول نہیں کرتا کہ وہ ایک فرض شناس، ایمان دار انسان ہوتا ہے۔ اسی فرض شناسی اور ایمانداری کی بنیاد پر برصغیر کی تقسیم کے بعد لوٹ مار کے پیش نظر حکیم صاحب اپنا سب کچھ فیاض کے حوالے کر کے سرحد پار چلا جاتا ہے اور فیاض اور تلسی کے وصال کے خواب، خواب ہی رہ جاتے ہیں۔ مگر فیاض کئی برس تک حکیم صاحب کے گھر اور مطب یعنی دکان کی حفاظت امانت کے طور پر کرتا رہتا ہے۔

نواب آف بہاول پور صادق خان عباسی ایک ایسا کردار ہے جو اس دور کا بہترین حکیمران سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں ریاست میں جو امن و سکون تھا اس کی مثالیں آج تک دی جاتی ہیں۔ تقسیم کے وقت اس نے بہت سے سکھوں اور ہندوؤں کو باحفاظت سرحد پار پہنچایا تھا۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کے دامن پر ایک ایسا داغ موجود ہے جو شاید صدیوں تک نا دھل سکے۔ وہ داغ یہ ہے کہ ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق کر کے اور پھر ون یونٹ کے قیام کے بعد نواب صاحب وظیفہ لیے کر ریاست اور ریاستیوں سے بے وفائی کر کے دور دیس جا بیٹھا۔ ریاست کی عوام کے لیے یہ صورتحال بھی تکلیف دہ تھی کہ جب نواب صاحب نے مہاجرین کے لیے خصوصی فنڈ کا قیام اور ریاستی وسائل کے دروازے کھول دیے تھے۔ اس کام سے ریاست کے مقامی لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر بے حس اور مجبور ہو گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ریاست میں در آنے والے مہاجر افسران اس صورتحال میں جلتی پر تیل کا کام کرتے رہے۔

ناول کا ایک کردار وادھو بھی ہے جو فسادی اور تعصبی ہے۔ وادھو حکیم رام لعل سے اپنا علاج اس لیے نہیں کراتا کہ وہ ہندو ہے اور حکیم سے مذہبی تعصب کی وجہ سے نفرت کرتا ہے مگر یہی وادھو ہے جو حکیم کی دکان پر نظر رکھے ہوتا ہے۔ وادھو اس چکر میں ہوتا ہے کہ کب ریاست پاکستان کے ساتھ اپنا الحاق کرے گی اور میں اس حکیم کو یہاں سے

بے دخل کر کے اس دکان کا مالک بن جاؤں گا۔ جب ریاست پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کرتی ہے تو اس وقت کے شر پسندوں کو شہ دے دی کہ یہاں سے ہندوؤں اور سکھوں کو بھگا کر ان کی املاک پر قابضہ کر لیں۔ اس مقصد کے لیے جہاں سیاسی طور پر تعصب کو ہوا دی گئی اور شر پسندوں کی چھوٹی افواہوں پر ہندوؤں کی مذہبی رسومات میں مداخلت سے ریاست کے اقلیتی طبقے کو جان کے لالے پڑ گئے۔ اس صور میں وادھو جیسے کئی شر پسند حکیم صاحب کی دکان اور گھر پر قابض ہونے کے لیے آ گئے۔ حکیم صاحب جو صورتحال کو بگڑتا دیکھ کر پہلے ہی سب کچھ فیاض کے حوالے کر کے سرحد پار چلے گئے تھے۔ فیاض پر پہلے وادھو، پھر پیری بدمعاش اور آخر کار فیاض کے چچا نے حکیم رام لعل کی دکان اور مکان ہتھیانے کی کوشش کی اور فیاض کو کوٹ کچہری میں کئی مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی مذہبی تعصب کی آڑ میں ہوس کار فرما رہی اور تقسیم کے فوری بعد ہر مسلم شہری وادھو بن گیا۔ جس نے ہندوؤں کی املاک پر قبضہ اور لوٹ مار اپنا مذہبی فریضہ سمجھ لیا تھا۔

وادھو کا اپنی گھر والی کے ساتھ بھی روایہ اچھا نہیں ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنی بیوی پر ظلم و ستم کرتا رہتا ہے کیونکہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہو رہی ہوتی۔ اس لیے وہ اولاد کا نہ ہونے کا قصوروار اپنی بیوی کو قرار دیتا ہے حالاں کہ وہ خود بنجر ہوتا ہے۔ پھر بھی وادھو اپنا علاج نہیں کراتا بلکہ اپنی بیوی کو علاج کروانے کا کہتا ہے اور اس کی ماں اس کی بیوی مہراں کو ایک جعلی بابے کے پاس لیے جاتی ہے۔ اس ناول میں ہمارے سماج میں عورت پر جو مظالم کیے جاتے ہیں اور عورت کو انسان کی بجائے صرف جنس کی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس کو بھی محمد حفیظ نے موضوع بنایا ہے کہ ہمارے معاشرے کے اندر وادھو جیسے کردار موجود ہیں جو عورت کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتے ہیں اور عورت سماجی ناانصافیوں کی وجہ سی معاشرتی جبر کا شکار ہوتی رہتی ہے۔

بھوپے کا کردار محمد حفیظ نے پیش کر ہمارے معاشرے میں ایسے کئی ناسوروں کی طرف اشارہ کیا ہے جو معاشرے میں ہر طرف پھیل چکے ہیں۔ ہمارے سماج کی عورتیں اولاد کے حصول کی خاطر جب ان جعلی پیروں، فقیروں اور بابوں کے پاس دم درود کرانے جاتی ہیں تو جنسی تشدد کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اپنی کم عقلی، توہم پرستی اور جاہلانہ خیالات کی وجہ سے اولاد تو نہیں پا سکتیں مگر اپنی عصمت گنوا بیٹھتی ہیں۔ جیسے وادھو نے اولاد نہ ہونے کی ساری ذمے داری اپنی بیوی پر ڈال کر اس کو ایک بھوپے کے پاس لے جاتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے خود علاج کی ضرورت ہے۔ لیکن مرد اپنے بنجر پن کو جانتے ہوئے بھی خود کو زرخیزی کا منبع تصور کرتا ہے۔

1955ء میں جب ریاست بہاول پور ون یونٹ کی زد میں آتی ہے تو فیاض جیسے شعور رکھنے والوں کے لیے ریاست کی پہچان اور اپنی ساخت بچانا زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ فیاض ون یونٹ کے خلاف تحریک کا حصہ بنتا ہے تو اس کو بھینس چوری کے جرم میں دس سال جیل کاٹنا پڑتی ہے۔ جیل سے رہائی ملنے کے بعد بھی فیاض ریاست کی

شناخت کی بحالی کی کوشش کر رہتا ہے۔اس طرح فیاض ایک احتجاجی جلسے میں پولیس فائرنگ میں شہید ہو جاتا ہے۔فیاض کے کردار میں کئی سچے اور مخلص افراد کی گمنام شہادت کا ذکر بھی موجود ہے۔جو ملک و قوم کا درد رکھتے ہیں،اپنی مٹی سے محبت کرتے ہیں اور اس کی حفاظت میں مار دے جاتے ہیں۔پاکستان کی حفاظت میں بھی کئی فیاض کام آئے مگر ان کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

فیاض کا کردار ریاست کا مقدمہ بڑی خوب صورتی سے لڑتا ہے۔محمد حفیظ نے فیاض کے ذریعے ریاست کی باشعور افراد کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب ریاست بہاول پور کا نواب بے بس ہو کر کسی دوسرے دیس چلا جاتا ہے۔اس وقت ریاست کی عوام اپنی جان کو خطرات میں ڈال کر ریاست کی شناخت کا مقدمہ قانونی اور سیاسی طور پر لڑتے ہیں۔یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ طاقت ور طبقہ اپنے مفادات کی خاطر عام عوام کا خون چوس لیتا ہے اور پھر مشکل وقت میں اپنی مٹی سے بے وفائی بھی کر جاتا ہے۔مگر غریب عوام اپنی دھرتی سے وفا کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ دے کر مٹی کا قرض ادا کرتی ہے۔جس طرح فیاض نے کیا۔خورشید ربانی لکھتے ہیں:

> "شناخت کے تحفظ اور تلاش کے سفر میں فیاض کی کہانی صرف اس کی یا بہاول پور کی داستان نہیں۔اسے عالمی تناظر میں پاکستان کی مجموعی صورتحال سے ملا کر دیکھیں تو یہ پاکستان کی کہانی بھی ہے۔اس بڑھ کر یہ ہر اس فیاض کی کہانی ہے جو دنیا کے کسی بھی خطے میں اپنی شناخت تلاشتا پھر رہا ہے۔گلوبل ویلیج کے اس زمانے میں یہ کہانی دنیا کی متعدد قوموں کی داستان بن کر سامنے آتی ہے۔"[12]

انواسی:

محمد حفیظ نے اپنے دوسرے ناول "انواسی" میں بھی بہاول پور اور ملتان کے خطے کی تاریخ کو قلم بند کیا ہے۔یہ کہانی اس زمانے کی ہے جب انگریز انتظامیہ نے کراچی سے لاہور کے تجارتی مرکز تک ریلوے ٹریک بچھانے کا کام شروع کیا۔جب 1872ء میں بہاول پور اور ملتان کے درمیان بہنے والے دریائے ستلج پر پل تعمیر کرنے کی باری آئی تو وہاں پر ایک چھوٹی سی بستی "آدم واہن" کا قدیم قبرستان مسئلہ بن گیا۔انگریز انتظامیہ اس قبرستان کی باقیات کو دوسری جگہ پر منتقل کر کے وہاں سے ریلوے ٹریک بچھانے کی کوشش کرتی ہے مگر بستی والوں کو یہ عمل کسی صورت بھی قبول نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے بزرگوں کی قبریں کھود کر ان کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتے۔بستی کی نوجوان نسل میں مذہبی جنونیت میں اس وقت مزید اضافہ ہوتا ہے جب بستی کا امام مسجد مولوی جاراللہ فتویٰ جاری کرتا ہے کہ قبریں اکھاڑنا شریعت کے خلاف ہے۔اس فتوے کے بعد بستی کا ہر جوان قبرستان کی حفاظت کے لیے کمر بستا ہو جاتا ہے اور انگریز

انتظامیہ کی مزاحمت کے لیے سامنے آجاتا ہے۔ انگریز انتظامیہ کچھ عرصہ تو صبر سے کام لیتی ہے مگر جب بستی والوں کی مزاحمت کم نہیں ہوتی تو وہ ایک دن، رات کو آپریشن کر کے قبرستان کو مسمار کرتے ہوئے جو بھی مزاحمت کرنے کے لیے سامنے آتا اس کو قتل کر دیا جاتا۔ اس طرح بستی کے 22 نوجوان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

محمد حفیظ نے اس ناول میں مذہبی منافرت، ذہنی و دلی کشمکش، انسانی نفسیات اور طبقاتی اونچ نیچ کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول کے ذریعے ہمیں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح کم عقلی اور تعلیم نہ ہونے کی وجہ لوگ مفاد پرستوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارا دین تو مرد اور عورت دونوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے لیکن اسلام کے نام نہاد مبلغ ہی اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ عوام کو شعور سے دور رکھ کر ہم مفاد حاصل کرتے رہیں اگر عوام کے پاس شعور کی دولت آگئی تو پھر ان کی دکان کو تالہ لگا جائے گا۔ اس لیے سر سید احمد نے جب مسلمان کو تعلیم کی طرف توجہ دلائی تو اس کو اسلام دشمن کہا گیا اور آج تک کہا جاتا ہے۔ خورشید ربانی کا اس حوالے بیان ہے۔

> "تعلیم سے بے بہرہ معاشروں میں اس قسم کی تباہیاں ہمیشہ سے ہوتی رہی ہیں۔ برصغیر کے مڈل اور اس سے بھی نیچے کے طبقوں کے حالات کا بہ غور جائزہ لیا جائے تو وہاں ملائیت اور جاگیر داری ہی حکیمران رہی ہے جو اپنے مفادات کے حصول کے لیے نہ صرف لوگوں کی عزتوں سے کھیلتی ہے بلکہ ان کی جان لینے سے بھی نہیں کتراتی۔ جاگیر دار اور ملاں عوام کو تعلیم سے دور رکھتے ہیں تاکہ وہ ان کے مفادات کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔ یہ کام دیہی علاقوں میں ایک وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی آسمان کو چھوتی ترقی کے باوجود پاکستان کے متعدد دیہی علاقے آج بھی پانی، صحت اور تعلیم کی سہولت سے اس طرح محروم چلے آتے ہیں جیسے صدیوں سے تھے۔ لگتا ہے یہ بیماری ازل سے ان دیہاتی مکینوں کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے۔ اس ضمن میں سندھ، بلوچستان، کے پی کے یا پنجاب کی کوئی تخصیص نہیں، زور آور جہاں بھی ہیں، ان کا طریقہ واردات ایک جیسا ہی ہے۔"[13]

سنگری اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بولڈ لڑکی ہے۔ یہ ضدی، خود سر اور من مانی کرنے والی لڑکی ہوتی ہے۔ یہ اپنے مزاج اور فکر و احساس کی وجہ سے مشکلات میں گھری رہتی ہے اور ایک دن سیلاب کے دوران ملبے کے نیچے دب کر مر جاتی ہے۔ یہ لڑکی ازل سے معاشرے کی زنجیروں میں قید رہتی ہے۔ سنگری دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے خوابوں میں ایک شہزادہ بسائے رکھتی ہے اور اس شہزادے کی خوبیاں بھی گنواتی ہے۔

"مرد تو وہ کسی کام کا ہوتا ہے جو عورت کے ترلے نہ کرے، نیچے لگا کے رکھے مگر پیار سے۔ تھپڑ مارے مگر جوتا نہیں۔ خود بے شک مار مار کے نیلو نیل کر دے، چمڑی ادھیڑ دے مگر کسی اور کو انگلی نہ کھڑی کرنے دے۔ بستی کا وڈکانہ ہو مگر وڈکوں جیسا ہو، وہ گالیاں بھی دے تو کانوں میں ماکھی ٹپکے، ظلم کرے تو اس پر پیار آئے۔ وہ قدم بھرے تو بھوئیں کو کانبا ہو۔ چاند نکلے تو وہ مشکی سانپ کی طرح کالا لگے اور رات کالی ہو تو چاند بن جائے۔ پوہ میں ٹھنڈی لوری چلے یا ہاڑ میں تتی لو پورا پنڈا اس کی تانگھ میں ہوں ہوں کرنے لگے۔ بدل گرجے تو وہ یاد آئے اور دریا چڑھے تو اس کا سینہ سامنے ہو۔"[14]

لیکن سنگری کا یہ خواب، خواب ہی رہتا ہے کیونکہ سنگری کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے ہے جہاں پیدا ہوتے ہی بچوں کے نکاح کر دیے جاتے ہیں۔ سنگری کے والدین نے بھی بچپن میں اس کا نکاح سدے نامی لڑکے سے کر دیا تھا۔ سدا جو جوان ہو کر بستی کا سب سے بڑا بدمعاش بن جاتا ہے۔ سنگری کو سدا اس لیے بھی اچھا نہیں لگتا ہے کیونکہ سنگری اپنے حسن پر نازاں ہوتی اور وہ چاہتی ہے کہ دوسری لڑکیوں کی طرح بستی کے لڑکے اس کو بھی چھڑیں لیکن سدے کی نسبت کی وجہ کوئی بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

ایک دن سنگری سدے کے پاس جاتی ہے جب وہ قبرستان کا پہرا دے رہا ہوتا ہے۔ سنگری غصے میں سدے کو کہتی ہے کہ اگر تجھے مرنے کا اتنا شوق تھا تو تو نے پھر مجھے اب تک اپنے نکاح میں کیونکہ رکھا ہوا ہے۔ وہ سدے کو گالیاں سنا کر اور دھمکیاں دے کر گھر لوٹ آتی ہے۔ کچھ دن بعد سدا سنگری کو اس کی اشتعال انگز باتوں پر گھر سے رات کو اغوا کر لیے جاتا ہے اور اس کے ساتھ جنسی تشدد کرنے کے بعد زندہ درگور کر دیتا ہے۔

سنگری ایک ایسی عورت ہے جو نسلوں کی پرورش فطری جذبے کے تحت کرنے کا شعور رکھتی ہے۔ وہ سدے کے زبردستی زیادتی کو اپنی جان سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اس کے بچے کی زندگی کی خاطر وہ بستی کے مولوی جار اللہ سے شادی کر لیتی ہے تاکہ کوئی اس پر بدکاری کا الزام نہ لگا سکے۔ جب مولوی صاحب سے شادی کو چھ ماہ ہوتے ہیں تو سنگری کا بیٹا پیدا ہوتا ہے جس کا نام امانت رکھتی ہے کیونکہ وہ اس بچے کو سدے کی امانت سمجھتی ہے۔

مولوی جار اللہ کا قتل مذہبی عصبیت میں مبتلا افراد کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ جب بستی آدم وہن کا قبرستان مسمار کیا گیا تو اس میں ساتھ درویشوں کے ساتھ شہیدوں کی قبریں بھی شامل تھیں۔ ان درویشوں سے صرف دین اسلام کے لوگوں کو ہی عقیدت نہیں بلکہ دوسرے تمام مذاہب کے لوگوں کو ان سے محبت و عقیدت تھی۔ بستی اس وقت میدانِ

جنگ کا منظر پیش کرنے لگی جب سال بعد زندہ پیر کے میلے پر چالیس درویش آئے اور انہیں اپنے سات شہیدوں کی قبروں کی کوئی نشانی نہ ملی تو وہ رونے لگ گئے۔ اس کا ناول میں یوں ذکر ہوا ہے۔

> "شہیدوں کی قبروں کے ساتھ اس قسم کا سلوک بھی ہو سکتا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ تھی کہ جن بستی والوں کو دریائے ستلج کے ہر سال عذاب سے بچانے کے لیے شہیدوں نے یہاں دفن ہونے کی وصیت کی تھی انہی شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہیں کی گئی۔ درویش دہائی دے رہے تھے کہ اگر واقعی شہیدوں کی قبروں کی بے حرمتی کی گئی ہے تو اس میں اب آدم کا ٹھکانہ ممکن نہیں رہا ان کے نزدیک شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہ کر سکنا بھی ان کی بے حرمتی ہی تھی۔"[15]

سماجی اور مذہبی عقائد کے افراد جب مل جاتے ہیں تو وہ ایک خطرناک جنون کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بستی آدم واہن میں مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد تھے۔ مولوی جار اللہ کا تعلق اس مسلک سے تھا جو ان لوگوں پسند نہیں کرتا تھا جو ہر سال زندہ پیر کے میلے میں آتے تھے۔ دوسرا انگریزوں کے ظلم و ستم کی انتہا یہ تھی کہ انہوں نے قبرستان کو مسمار کر کے بستی کے مذہبی لوگوں ٹھس پہنچائی تھی۔ جس کی وجہ پھر مذہبی عصبیت سامنے آئی اور بستی میدانِ جنگ بن گئی۔ ان چالیس درویشوں کے ساتھ بستی کے سب لوگ مل کر مولوی جار اللہ کو قتل کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ جس کا ناول میں یوں بیان ہے۔

> "اسی دوران کسی نے وہاں خبر اڑادی کہ سات شہیدوں کی قبروں کو مسمار کرا کر ان کے آثار مٹانے میں مولوی جار اللہ کا ہاتھ ہے کہ جو مخالف مسلک کے پیروکاروں کا کرنا دھرنا ہونے کے ساتھ ساتھ پیر زندہ کرامت کے میلے کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔"[16]

ایسے حالات میں لوگ انسانیت اور عقل سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر اس شخص کو اپنا دشمن مناتے ہیں جو ان کے بارے میں کبھی کسی رائے کا قائل ہوا ہو۔ ہجوم میں لوگوں کا اضافہ اس قدر ہوا کہ بستی والوں کو یہ احساس بھی نہ رہا کہ ان کے ساتھ کون شخص کھڑا ہے۔ اس جنون کی کیفیت میں مولوی جار اللہ کو قتل کر ڈالا۔ اسطرح ایک بااثر شخصیت پل بھر میں ایک لاش کی شکل میں بدل گیا۔ وہ بھی بے قصور ہوتے ہوئے۔ مولوی صاحب کا ادب و احترام کرنے والے افراد نے ہی اس کے گھر کو آگ لگادی۔ اصل اس محرک کے پیچھے وہ لوگ تھے جو مذہب کی آڑ میں ان افراد کے اندار انتہا پسندی پیدا کر دیتے ہیں کہ ان سب کے درمیان پھوٹ ڈال کر ان کا استحصال کرتے رہتے

ہیں۔ مولوی صاحب کے مر جانے بعد جہاں اس کی وراثت اور جانشینی کا تھا وہیں پر سنگری کو اپنے بیٹے کے لیے محافظ کی ضرورت ہوئی۔

مولوی جار اللہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے مولوی اللہ بخش عرف بخشو کو جانشین بنادیا جاتا ہے۔ جو مولوی جار اللہ کے چھوٹے بھائی مولوی اللہ رکھے کا ہم عمر تھا مگر بخشو اپنے اثر ورسوخ کی وجہ جانچین بن جاتا ہے۔ مولوی بخشو نے سنگری پر غلط نظر رکھنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ سنگری کے پاس آنے جانے لگتا ہے۔ سنگری مولوی بخشو کی حرکت سے اس کی نیت سمجھ جاتی ہے۔ سنگری کے لیے آئے دن مشکل بڑی رہی تھی۔ مولوی بخشو ہر طرف سے سنگری کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش میں تھا۔

> "مولوی اللہ بخش جیا جیا اور جیول جیول کر پوچھتا کہ ہئیں جی! سنا تو یہ تھا کہ چھ ماہیا بچہ بچ نہیں پاتا۔۔۔ مگر یہ امانت ہے بہت خوش قسمت کہ چھ ماہیا پیدا ہو کر بھی ماشااللہ بچ بچا گیا ہے۔ سنگری جونہی چوٹ کھا کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ ڈسنے والے انداز میں مسکرا دیتا۔ ویسے ماشاءاللہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ چھ ماہیا پیدا ہوا ہے۔۔۔ قدبت سے تو پورا پکا نو مہینے کا۔ پھر مزید زہر انڈیلنے کے واسطے مسکراہٹ کچھ اور گہری کر لیتا ہے۔ ویسے اللہ بخشے حضرت والد صاحب بھی خوب تھے صلہ رحمی میں توحد سے گزر جاتے تھے۔"[17]

اس طرح سے مولوی بخشو نے سنگری کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مولوی بخشو نے جانشیں ہونے کا فائدا اٹھا کر سنگری کا استحصال کرنے لگ گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں گھر کا بڑا ہو تو میری ہر بات کو سچ مانا جائے گا۔ اس لیے وہ سنگری کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کی خواہش کی تکمیل کرے۔ مگر دوسری طرف سنگری ایسا کرتی بھی تو اپنا استحصال کرواتی اور اگر انکار کرتی تو بھی استحصال ہوتا۔ ان سب مشکلات سے نکلنے کے لیے سنگری مولوی اللہ رکھے کا سہارا تلاش کیا۔ مولوی اللہ رکھے کو زنانہ خانے میں بلا کر اس کو اپنا آپ سونپنے کی بات کیا اور مولوی اللہ رکھا سنگری کی باتوں میں آگیا تھا۔ جب مولوی اللہ رکھا بڑے زنانہ خانے میں گیا تو وہاں اس پر اس کو ظلم و ستم کر کے مار ڈال تھا۔ مولوی اللہ رکھے کی موت کا الزام سنگری کے سر پر ڈال کر مولوی بخشو پھر سے سنگری کو مجبور کرنے لگ جاتا ہے۔

آخر کار سنگری بے بس ہو کر مولوی بخشو کی خواہش کی تکمیل کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ اسطرح بخشو خوش ہو جاتا ہے اور سنگری کے گھرانا ج اور دوسری ایشاء ضرورت آنے لگ جاتی ہیں۔ اس طرح ایک دن مولوی بخشو سنگری کے ساتھ نکاح کر لیتا ہے۔ سنگری مشکلات کا سامنا کرتے کرتے ایک دن سیلاب میں مر جاتی ہے۔

سنگری کے صوتی طور پر ایک اور لفظ "سنگھنی" کے روپ میں اس کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے منیر فیاض لکھتے ہیں۔

> "سنگری نام اپنی صوتیات میں لفظ "سنگھنی" کے بہت قریب ہے۔ شاستروں میں عورت کی ایسی قسم کو سنگھنی کہا جاتا ہے جو بڑی بڑی آنکھوں، بھرواں چھاتیوں اور کولہوں کی مالک ہو۔ ایسی عورت چلتے وقت بدن کو جھٹکا دیتی ہے۔ اس سے محبت کا حصول بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسے غصہ بہت آتا ہے اور یہ آزاد رہنا پسند کرتی ہے۔ ازدواجی تعلقات میں یہ مرد پر حاوی رہتی ہے۔ اس کی جنسی خواہش بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور آگ لگانا اس کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔ شاستروں میں مذکور "تریا چلتر" یعنی عورت کی فطرت مکاری ایسی عورت کے حسن کے ساتھ مل کر اس کی تخریبی قوت کو مزید طاقت دیتی ہے۔ سنگری کا صرف صوت ہی نہیں بلکہ اس کا سراپا اور عادات بھی اس عورت سے مماثل ہیں۔"[18]

محمد حفیظ نے سنگری کے کردار کے پس منظر میں سماجی جبر کا شکار عورت کا نوحہ پیش کیا ہے۔ عورت ذات کے سماج سے، یہاں کے مقتدر طبقے سے اور اپنے ان داتا سے احتجاج کی ایک تصویر ملاحظہ کیجے اور اس دکھ کو سمجھنے کی کوشش بھی کریں جو اس عورت کو لاحق ہیں۔

> "کتنی بدقسمت ہے عورت اس دھرتی کی کہ کسی مرد کی غیرت کے باڑے میں جنم لے کر آزادی اور چاہے جانے کے خواب دیکھتے ہوئے کبھی ہاری ہوئی جنگ کا تاوان بن کر قیمت چکاتی ہے اور کبھی اس کی اگلی نسل کی بڑھوتری کے ڈھکوسلے میں بار بار دیواروں میں چنوائی جاتی ہے، انانیت کے نام پر مصلوب ہوتی ہے اور تلذذ کی آڑ میں تذلیل جھلیتی رہتی ہے۔"[19]

سنگری کا تانیثی شعور بھی سامنے آتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ان تمام امتیازات اور ناانصافیوں کا سامنا کرتی ہے۔ جو معاشرے کی ہر عورت کو کرنا پڑتا ہے، ایک عورت کو معاشرے میں بہت سے مسائل پیش آتے ہیں۔ مگر اس زمانے میں انگریزی تسلط کے زیر اثر مردوں کی ذہنی حالت نے عورت کا زندہ رہنا مشکل کر دیا تھا۔ اس کا ناول میں ذکر یوں ہے۔

"او میری ماں تو تو جانتی ہے کہ یہ باتیں ہمیں اور کوئی نہیں سکھاتا، پیدا ہوتے ہی ہمارا عورت ہونا ہمیں یہ سبق پڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اب مکرے تو اور بات ورنہ یہ باتیں تجھے بھی معلوم ہیں اور مجھے بھی معلوم ہوتی جا رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تو انہیں زبان سے نکالنا نہیں چاہتی اور مجھے وہ حرامی سیدا زبان سے نکالنا سکھا گیا ہے۔ وہ ویسا ہی مرد تھا جیسا میری طرح کی عورت کو چاہیے ہوتا ہے مگر اس دھی چود کو میری "ناں" کو سمجھنا ہی نہیں آیا، بجائے میری چمڑی ادھیڑنے کے، میرے اندر ہی تھوک کر چلا گیا اور وہ بھی زبردستی۔ ان بھڑوے مردوں کو پتا ہی نہیں کہ عورت ہے کیا اور کیا چاہتی ہے۔ یہ عورت کو اس کے چڈے چیر کر فتح کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ عورت کہتی ہے کہ میرا دل چیر کر مجھے فتح کرو مگر یہ حرامی اپنی اکڑ خانی قائم رکھنے کے چکر میں نہ دیکھ پاتے ہیں اور نہ سن پاتے ہیں، بس ترلے کرتے ہیں، تلوے چاٹتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہ بن سکے تو جانوں مار دیتے ہیں۔"[20]

دوسرا کردار اس ناول کا مولوی جار اللہ کا ہے جو پہلے مذہبی تعصب کی وجہ سے قبرستان کو مسمار ہونے سے بچانے کے لیے بستی کی عوام کو یہ فتویٰ جاری کرتا ہے کہ قبریں اکھاڑنا شریعت کے خلاف ہے۔ مگر جیسے ہی مولوی صاحب کو انگریز انتظامیہ سے مراعات وغیرہ ملتی ہیں تو وہ اپنا فتویٰ واپس لیتے ہوئے بستی والوں کو کہتا ہے کہ حکومتی کاموں میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے کیونکہ وہ ہمارے ہی فائدے کے لیے سب کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ اپنے بزرگوں کی باقیات کو دوسری جگہ دفن کر دیں۔ مولوی صاحب کا دوغلے پن کا کردار ہے جو اپنے مفادات کو دیکھ کر مذہب کی آڑ میں عوام کو استعمال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب ہوس کا بھی مارا ہوا ہے۔ مولوی کی گھر میں کئی خواتین پہلے نکاح میں موجود ہوتی ہیں مگر سنگری کے حسن کو دیکھ کر آخری عمر میں شادی کر لیتا ہے۔ اس بات کا علم ہوتے ہوئے بھی کہ سنگری کے پیٹ میں کسی اور کا بچہ ہے۔ شادی کے چھ ماہ بعد جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو بستی کی بے شعور عوام مولوی صاحب پر سوال اٹھانے کی بجائے اسے مولوی صاحب کی کرامت سمجھ لیتے ہیں۔ یہ اس معاشرے کی ذہنی افلاس اور جہالت کا گہرا طنز ہے۔ عوام کو اصل دین سے اور تعلیم سے اس لیے دور رکھا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی اپنی دکان بھی چلتی رہے اور یہ جو کچھ کریں ان کو کوئی کچھ کہنے والا نہ ہو۔ اس بات کا سنگری کو علم تھا اس لیے اس نے اپنے مولوی صاحب کو بہتر چوکیدار سمجھا۔

"اس کے حمل کی بحفاظت واضعگی کے لئے مولوی صاحب سے بہتر چوکیدار کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ بستی کے لوگ ارشتے دار سنگری پر حرام کاری

کاالزام لگاتے تو پھر بھی سزا کے لئے مولوی صاحب نے ہی پیش پیش ہونا تھا لیکن اس نکاح کے بعد نہ تو مولوی صاحب نے آواز نکالی اور نہ ہی کسی اور کو جرات ہوئی۔ ملوکاں کو اپنی بیٹی کی معاملہ فہمی پر حیرت ہو رہی تھی۔"[21]

جب بستی کی عوام کو مولوی صاحب کے بارے میں علم ہوا کہ مولوی صاحب انگریز انتظامیہ سے ملا ہوا ہے۔اس ہی کی وجہ سے بستی کے 22 جوان قتل ہوئے اور قبرستان مسمار کیا گیا تو لوگ مولوی کی جان کے دشمن بن گئے۔ مولوی صاحب کی پھر ایک بھی نہیں سنی گئی اور اس کو پاؤں کی پے در پے ضربات سے کچل ڈالا۔لوگوں کی وحشت اور بربریت دیکھنے والوں کے لیے ناقابل یقین تھی کہ اس حد تک بھی وحشت ہو سکتی ہے جو ایک زندہ انسان کو کچل کر گوشت کی ڈھیری بنادے۔ وہ سماج جنونی اور غیر انسانی بن چکا تھا، کبھی بے شعور اور کبھی اتنا ظالم کہ درندہ بن چکا ہو۔ کل تک جس مولوی کے سامنے سر نہ اٹھانے والوں نے آج اسی مولوی کو مار دیا۔

سیدا ناول کا ثانوی کردار ہے مگر یہ مذہبی تعصب اور نسلی تعصب میں مبتلا نظر آتا ہے۔ سیدے کا تعلق مسلمان گھرانے سے ہوتا ہے اور وہ بستی کا سب سے بڑا بدمعاش ہوتا ہے۔ سیدا اپنے باپ کی طرح بستی کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتا ہے۔ سیدے کا باپ نکھیرو بھی بستی کا بدمعاش تھا جو بستی کے سانسیوں کی لڑکی کو اغوا کر کے جلال پور کے شہر بیچ آیا تھا اور ایک بار جلال پور کے اسی زمیندار کی مدد کر کے سانسیوں کی دو اور جوان لڑکیاں غائب کروادیں۔ نکھیرو اٹھار سال کی عمر میں گھر سے غائب ہو کر مظفر گڑھ چلا گیا اور وہاں سے دو سال بعد ایک لڑکی کے ساتھ بستی آدم واہن واپس آیا تو بستی کے سب لوگوں کو لگا کہ یہ پھر کسی کی بیٹی کو اغوا کر کے لیے آیا ہے۔ نکھیرو نے بتا بھی کہ وہ نکاح کر کے لیے آیا ہے مگر پھر بھی اس کے باپ نے مولوی کو بول کر نکاح پڑھایا گیا۔اس نکاح کے سال بعد وہ لڑکی سیدے کی ماں کہلائی۔

سیدے کی ماں افغانیوں کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ سیدے کی ماں کے باپ داد مظفر گڑھ میں 50 سال سے آباد تھے اور سیدا کا باپ نکھیرو ان کے ہاں ایک دو سال تک ملازمت کرتا رہا پھر ایک دن ان کی لڑکی (سیدے کی ماں) کو بھگا کر آدم واہن لے آیا تھا۔جب پانچ سال بعد نکھیرو (سیدے کا باپ) کے دشمنوں سانسیوں کو سیدے کی ماں کے خاندان کا علم ہوا تو انہوں نے فورا مظفر گڑھ جا کر ان کو خبر دی کہ آپ کی لڑکی کو نکھیرو بستی آدم واہن میں رکھے ہوئے ہے۔ پھر افغانیوں نے سانسیوں کی مدد سے بستی آدم واہن میں آ کر نکھیرو کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر نکھیرو بچا گیا۔اس حملے کے کچھ عرصے بعد نکھیرو خود مر گیا۔

سیدے کے اندر نکھیرو کے خون کے ساتھ ہی افغانیوں کا تڑکا بھی لگا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے بستی کا ہر آدمی اس سے ڈرتا تھا اور اس کے خلاف کسی میں آواز اٹھانے کی جرت نہیں تھی۔ جب انگریز سرکار نے بستی کے قبرستان کو

مسمار کرنی کی بات کی تو سب پہلے سیدا ہی اپنے ساتھیوں سمیت قبرسان کے چاروں طرف پہرا دینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"نوجوان کا خیال تھا کہ گورے صاحب کے اس حکیم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے جس کی رو سے وہ ان کی بستی کے قبرستان کو برباد کر کے وہاں سے جنات کی فولادی بگھی گزارنا چاہتا ہے۔ اب بھلا کہاں لے جائیں گے وہ اپنی پیڑھی کے وڈکوں کی قبریں۔ کیا ان کے ہوتے ہوئے بھی ان کی جداد کی لاشیں اور ہڈیاں چیلوں اور کتوں کے کھانے کے لیے قبروں سے نکال باہر پھینکی جائیں گی؟ وہ مر جائیں گے مگر اپنے جی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ معاملہ صرف اس حد تک بھی نہیں تھا، وہ تو ان کے تن کو اجاڑ کر، ان کی کشتوں کو بے کار کر کے ان کے دریا پر لوہا ڈال کر اسے سکھانا چاہتا ہے۔ جب دریا میں پانی رہا نہ مچھی تو کھا جا کیا خاک ہو گا؟ اس سے پہلے بھوک اور پیاس سے مریں، کیوں نہ سب کو مار کر مریں۔"[22]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ بستی کے نوجوان سیدے اور اس کے ساتھی کس قدر اپنے اجداد سے محبت کرتے ہیں۔ محبت کی وجہ سے وہ نسلی عصبیت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ان کو اپنے اعلاقے اور ملک کی ترقی نظر نہیں آتی بلکہ انہیں اپنے اجداد کی قبریں زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ انگریز سرکار کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب بستی کے بڑے ان کو سمجھاتے ہیں کہ انگریز سرکار کے فیصلے کی مخالفت نہ کرو اسی میں آپ کی بہتری ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انگریز کبھی بھی اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹنے والے وہ ساری بستی کو قبرستان بنا کر اس کے اوپر سے ریلوے لائن بچھائے گا۔ اس لیے مٹھل ماچھی نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ انگریز سرکار سے ٹکر نہ لیں اور ان کو بتایا کہ آج سے کئی برس قبل ملتان فتح کرنے کے بعد سکھوں نے بہاول پور پر حملہ کیا تھا تو ان کی پشت پناہی انگریزوں نے کی تھی۔ مٹھل ماچھی نے مشورہ دیا کہ اپنے اجداد کی قبریں کہیں اور بنا دیتے ہیں۔ اس مشورے پر سیدا مٹھل ماچھی پر غصہ ہوا اور اس کو مارنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بات تب زیادہ بگڑ جاتی ہے جب مٹھل ماچھی اور بستی کے دوسرے بزرگوں کے مشورے کے خلاف مولوی صاحب ایک فتویٰ جاری کر دیتا ہے جس میں وہ شریعت کا حوالے دیتا ہے تو سیدا پہلے ہی مٹھل کو قتل کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے اب تو اس کا ارادہ مزید پختہ ہو جاتا ہے۔

"مگر مٹھل ماچھی کے مشورے پر مولوی جار اللہ نے یہ کہہ کر رندا پھیر دیا کہ ایسا کرنا میت کی توہین، صریحا کفر اور گناہ کبیرہ ہے۔ اب مولوی کے فتوے کے بعد کس کی مجال کہ کوئی اختلاف کرے لہذا وہاں بیٹھے ہوئے سب نے چپ سادہ لی۔

مٹھل ماچھی کا قبرستان سے وڈکوں کی ہڈیاں نکال کر کہیں اور دفنانے کا مشورہ بستی کے باہر کھڑے نوجوان تک پہنچا تو وہ مزید بپھر گئے۔

آخر کو ہے نا حرامی یہ وڈکو کڑا۔۔۔ قبر میں لاتیں ہیں اور چلا ہے وڈکو کی قبریں اکھاڑنے۔ سیدے کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں ابھی جا کر اتارتا ہوں اسے قبر میں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور بستی کی طرف لپکا۔ سیدے کو بستی کی طرف لپکتا دیکھ کر اس کا دوست سکندر ابھی تین چار جوانوں کے ساتھ بستی کی طرف بڑھا کہ اس کا ساتھ دے سکے مگر پیرو در کھان کا کڑیل بیٹا منگر اپنے دس بارہ ساتھیوں کے سمیت ان کی راہ میں روک کر کھڑا ہو گیا۔"[23]

سیدے کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے منگر آتا ہے۔ منگر وہ نوجوان ہوتا ہے جو بستی میں سیدے کی طرح طاقت اور جرت مند تھا مگر سیدے کی طرح جذباتی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر معاملے کو سوچ بچار کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے وہ سیدے کو بھی سمجھتا ہے کہ مٹھل ماچھی کی بات غلط نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات اس نے غلط وقت میں کر دی ہے اگر اس مٹھل ماچھی کی بات پر تم ذرا غور کرو تو سمجھ آ جائے گی۔ لیکن سیدا نسلی اور مذہبی عصبیت میں اس حد تک گرفتار ہوتا ہے کہ وہ اپنے خلاف ہر آدمی کا قتل کرنے پر تیار ہوتا ہے۔ اس نے منگر کی ایک بات تک نہ مانی اور منگر کو یہاں تک کہا کہ اگر اب مولوی بھی اپنا فتویٰ واپس لے تو بھی سیدا اپنا ارادہ نہیں بدلے گا۔ قبرستان کی ایک قبر بھی میرے ہوتے ہوئے نہیں مسمار ہو سکتی۔ سیدا غصے میں آ کر جو منگر کو جواب دیتا ہے اس کو ناول نگار نے یوں لکھا ہے۔

"منگر ہو جانے دے مٹی کے ساتھ مٹی اور خون خرابہ بھی۔ کم از کم یہ تو ہو گا کہ ہم اپنی آنکھوں سے اپنے وڈکوں کی بھرتی ہوئی ہڈیاں اور گلا سڑا ماس تو نہیں دیکھ سکیں گے نا!۔۔۔ اور سنو! میں آج قسم لینے جا رہا ہوں بستی کے سارے جوانوں سے کہ آخری دم تک کوئی بھی گوروں کو بستی میں گھسنے نہیں دے گا۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ اگر تم بھی ہمارا ساتھ

دینا چاہو تو دیگر ویلے چڑھدے والی ڈھنڈ کے پاس قسم دینے آ جانا۔"[24]

سیدا اور اس کے اسی (80) ساتھی قبرستان کی حفاظت کے لیے دن رات پہرہ دینے لگے۔ سیدے نے اپنے ساتھیوں کو منصوبے کے مطابق قبرستان کی ان سمتوں کی طرف کھڑا کر دیا جہاں جہاں سے ریلوے لائن گزرنی تھی۔

کچھ دنوں تک جب انگریز سرکار نے کوئی حملہ وغیر نا کیا تو سیدے کو ایسے لگا کہ انگریز سرکار اس سے ڈر گئی ہے مگر پھر بھی یہ خیال آتا کہ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سیدا کو اپنی موت کا ڈر نہیں تھا بلکہ وہ سنگری کے بارے میں فکر مند تھا۔ سنگری جو سیدے کی منگتر تھی بلکہ بچپن ہی میں سیدے کے ساتھ اس کا نکاح بھی ہو گیا تھا مگر ان کی ابھی تک شادی نہیں ہو پائی تھی۔ سیدے کو جیسے ہی سنگری کا یہ خیال آتا کہ میں انگریز سرکار کے ہاتھوں مارا گیا تو سنگری کا کیا ہو گا۔ سیدے نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ قبرستان کو انگریز سرکار کو دے کر ان سے کہے کہ یہاں سے ریلوے لاین گزر لے۔ میں سنگری کو کسی اور کا ہوتا نہیں دیکھ سکتا کہ کوئی دوسرا اس کو چھوئے یہ سیدا برداشت نہیں کرتا۔ مگر پھر سیدے کا اپنے اجداد سے محبت کا جذبہ ابھرتا ہے اور پھر وہ انگریز سرکار کے سامنے ڈٹ جاتا ہے۔ اب اس نے سوچا کہ سنگری ابھی اس کے جسم کا حصہ نہیں بنی ہے۔ وہ خود جن جسموں کا حصہ ہے وہ ان جسموں کی تذلیل ہوتی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سیدا کی نسلی عصبیت ہی ہوتی ہے، جو اس کو اپنے مشن سے کسی صورت ہٹنے نہیں دیتی ہے۔

> "تو کیا ہو گیا؟ یہ تو ہوتا آیا ہے، جو وجود ابھی تک اس کا ہوا نہیں، اس کے ساتھ مکلایا نہیں، وہ کسی ایک کا کیا، لکھ ہزار کا ہو جائے تو اسے کیا۔ وہ جوان قبروں میں لیٹے ہیں، وہ تو اس کے ماضی کا وجود ہیں، ان کے ماس سے تو وہ کشید ہوا ہے، وہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ ہوتا۔ وہ ان کے وجود کا رکھولا ہے، ان کی مٹی کا راکھا ہے، وہ مٹی جو اس کی اپنی ہے، وہ مٹی جو اس کے وجود کا تسلسل ہے، نہ کہ وہ جسم جو ابھی اس کا ہونا ہے۔"[25]

سیدا نسلی اور مذہبی عصبیت کی وجہ اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے ایک دن انگریز سرکار کے حملے سے بستی سے غائب ہو جاتا ہے۔ سیدے کے ساتھی کچھ تو مارے جاتے ہیں اور کچھ گرفتار ہو جاتے ہیں مگر سیدا کا کوئی علم نہیں ہوتا ۔ بستی کے لوگ سیدے کے بارے میں طرح کی باتیں کرتے ہیں کبھی کہتے ہیں سیدا انگریز سرکار کی قید میں ہے اور کبھی کہتے کہ سیدا کہیں فرار ہو گیا ہے۔ جو کچھ عرصے بعد ضرور آو پس آئے گا۔ لیکن کئی سال گزر جانے کے بعد بھی سیدا کا کوئی نام و نشان تک نہیں ملتا ہے تو لوگ سمجھ جاتے ہیں اب سیدا کہیں مر گیا ہے۔

نو آبادیاتی نظام برصغیر پاک و ہند میں اٹھارویں صدی کے وسط سے لیے کر انیسویں صدی کے نصف تک قائم رہا۔ نو آبادیاتی نظام سے مراد ہے کہ کسی طاقتور خطے کی عوام کا کسی کمزور علاقے پر قابض ہو جانا اور اس کمزور خطے کی عوام پر اپنے قوانین، معاشرت اور حکومت مسلط کر دینا، اسے نو آبادیاتی نظام کہتے ہیں۔ جب یورپ میں زرعی نظام کی جگہ صنعتی نظام نے لی تو وہاں پر بہت سے کارخانے اور فیکٹریاں لگنے لگی۔ صنعتی ترقی کی دوڑ میں یورپی اقوام ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے میں مصروف عمل ہو گئی۔ اس وقت ان کے پاس بھاری صنعتوں کے لیے خام مال کی بہت کمی تھی۔ جسے پورا کرنے کے لیے انھوں نے ایک منصوبہ بندی کے تحت اپنے کمزور اقوام کے علاقوں کا رخ کیا

اور وہاں جا کر اپنی کالونیاں بنائیں۔اس سارے عمل کو نوآبادیات کہا جاتا ہے۔ان کا بنیادی مقصد تو معاشی مفاد حاصل کرنا تھا مگر کچھ عرصہ بعد انھوں نے مقامی باشندوں کو اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعے ذہنی غلام بنانا شروع کر دیا۔اور ان خطوں میں اپنے قوانین کا اجراء کیا،اپنا نظامِ سیاست متعارف کروایا۔

نوآبادیاتی نظام کو ہندوستان میں اس وقت زیادہ مستحکم کیا گیا جب 1800ء میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو وہاں پر اشتراقی مطالعات کا ایک نیا ماڈل ایک نئی نہج کی تشکیل سے نوآبادیاتی نظام کو مزید مستحکم کر گئی۔ مشرقی تہذیب و تمدن کا مطالعہ حاکمانہ فکر کے زیر اثر ہونے کے نتیجے میں شعریات پر سیاست کا رنگ گہرا ہو گیا۔تاریخ سازی میں عصبیت اور گروہیت کو راہ ملی۔مذہب کی نئی تفسیریں اور تعبیریں بیان کی گئی۔عقائد کو شکوک کے دائرے میں لا کھڑا کیا گیا۔اس طرح دیکھا جائے تو برصغیر میں استعماری قوت کے پھیلاؤ کا آخری زمانہ بہت خطرناک تھا۔اس زمانے میں جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی اسیری کا آغاز ہوا ہے۔تاریخ کے وسیلے سے ثقافتی بیانیے کی تبدیلی کی جو نئی روش اٹھارویں صدی کے وسط سے شروع ہوئی تھی وہ یہاں آ کر اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔

محمد حفیظ نے اپنے اس ناول "انواسی" میں نوآبادیاتی عصبیت کو دکھانے کی بھی کوشش کی ہے۔نوآبادیاتی عصبیت، نسلی اور معاشی عصبیت کی صورت سے پیدا ہوتی ہے۔جب برصغیر میں انگریز آ کر آباد ہوئے تو انہوں نے اپنی الگ کالونیاں بنائیں۔انگریز خود کو اعلیٰ نسل تصور کرتے تھے اور ہندوستانیوں کو کمتر سمجھتے تھے۔اس کی تین وجوہات تھیں۔سب سے پہلے نسل پھر زبان اور تیسری وجہ علاقہ تھا۔اس لیے انگریزوں نے نسلی، لسانی اور علاقی عصبیت کی بنیاد پر ہندوستانیوں پر ظلم و جبر کے پہاڑ ڈھائے ہیں۔اس کے علاوہ سیاسی اور معاشی مفاد کی خاطر جو ہندوستانیوں پر ستم کیے وہ معاشی عصبیت کہلاتی ہے۔

> "سب سے پہلے برطانوی سرمایہ ریلوی پر لگایا گیا اور اس میں برطانیہ کی لوہا اور فولاد بنانے والی کمپنیوں اور بالخصوص انجینئرنگ فرموں کے اعراض مدِ نظر تھے، لیکن سب سے زیادہ ریلوں کی توسیع میں برطانوی کارخانوں کا فائدہ نظر آتا تھا کہ برطانیہ کی تجارت کا جال ہندوستان میں جلد از جلد پھیل جائے۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی کاروبار کے زمانے میں دولت کی کثیر مقدار ہندوستان سے کھینچ لی تھی جس نے انگلستان پہنچ کر بہت بڑے سرمایہ کی شکل اختیار کر لی تھی اور دراصل وہی سرمایہ تھا جو اب ہندوستان میں لگا دیا گیا۔"[26]

اس حوالے سے غلام اصغر کا بیان ہے۔

"نوآبادیاتی تسلط سیاسی اور معاشی دونوں طرح سے ہوتا ہے۔ عام طور رنوآبادیات مغلوب قوم کی زمین، خام مال، محنت مزدوری اور دیگر وسائل کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ استحصال وہ اکیلے نہیں کر سکتے بلکہ انھیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مقامی لوگوں سے کمک درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے "اندرونی استعمار" یا "داخلی نوآبادیات" کی تراکیب بنتی ہیں۔ داخلی نوآبادیات کسی ایک قومی ریاست یا معاشرے کے اندر "مرکز" اور "مضافات" کے درمیان استحصالی تعلقات کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کا اطلاق امریکا میں سفید و سیاہ تعلقات اور سوویت ریاست اور سوویت سماج کے درمیان استحصالی تعلقات کو بیان کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے (خاص طور پر کسانوں کے حالات جبری اجتماعیت کے تحت اور محنت کش طبقہ کے مسلط شدہ کاری کے تحت)"۔[27]

اس ناول میں نوآبادیاتی دور کے ریلوے نظام کی کہانی بیان کی گئی ہے جس میں ناول نگار نے ایک چھوٹی سی بستی کا قبرستان ریلوے لائن کی راہ میں آرہا تھا۔ انگریزوں نے اس قبرستان کو مسمار کر کے وہاں سے ریلوے لائن گزار دی اور اپنے اس سرمائے یا مفاد کی خاطر اس بستی کے کئی انسانوں کا خون بہا ہے۔ اس ایک واقعے سے ناول نگار نے نوآبادیاتی نظام کے پورے دور کی عکاسی کی ہے کہ گوری سرکار کس طرح برصغیر کے اصل باشندوں پر ظلم و ستم کرتے تھے اور اپنے مفادات کو حاصل کرتے تھے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ جب انیسویں صدی میں یورپ میں ریلوے انجن ایجاد ہوا تو برطانیہ نے اس کو اپنے نوآبادیاتی علاقوں تک توسیع دینی شروع کی۔ 1849ء میں اس نظام کو برصغیر پاک وہند میں بھی لانے کا سوچا گیا۔ جو چند سال بعد برصغیر میں کام شروع ہو گیا۔ اس کا ناول میں یوں بیان ہے۔

"انگریز سرکار کو برطانوی ہند میں ایک ایسا نظامِ نقل و حمل چاہیے تھا جو صرف سستا، جدید اور کثیر المقاصد ہو بلکہ محفوظ اور تیز رفتار بھی ہو۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں دخانی انجن کی ایجاد نے پہلے ہی یورپ میں انقلاب برپا کر رکھا تھا لہذا کیسے ممکن تھا کہ اسے برطانیہ کے زیر نگیں نوآبادیاتی خطوں تک توسیع نہ دی جاتی۔ سو پورے ہندوستان میں کئی ریل کمپنیوں کا قیام عمل میں لاتے ہوئے اپنے اپنے ریجن کی سطح پر ریلوے ٹریک بچھانے کے کام کا آغاز ہو چکا تھا"۔[28]

جب 1855ء میں انگریز انتظامیہ نے کراچی کی بندگاہ کو لاہور کی منڈویوں تک ریلوے لاین کے ذریعے جوڑنے کا کام شروع کیا تو سنڈی کمپنی کو 108 میل طویل کراچی تا کوٹری تک ٹریک بچھانے کا کام سونپا گیا جو 1861ء میں مکمل کر لیا گیا۔ جب کہ دوسری پنجاب ریلوے کمپنی نے لاہور کو ملتان سے جوڑنے کا منصوبہ 1865ء تک مکمل

کیا۔اب صرف ملتان کو کوٹری سے جوڑنا تھا اس کے لیے 1871ء میں "انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے" کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس کے تین ڈویژن بنائے گے ملتان کو روہڑی، روہڑی کو سکھر اور سکھر کو کوٹری سے ملانے کے لیے بیک وقت کام کا آغاز کر دیا گیا۔ مگر اس سب معاملے میں مسئلہ تب بنا جب بہاول پور اور بستی آدم واہن کے درمیان دریائے ستلج پر پل تعمیر کرنے کی باری آئی۔

آدم واہن کی بستی دریائے ستلج کے کنارے پر آباد تھی اس بستی کا ایک قدیم قبرستان تھا جو ساری کہانی کا مرکز بھی ہے۔ یہ قبرستان ریلوے ٹریک کے رستے میں آرہا تھا اس کو انگریز انتظامیہ مسمار کر کے ٹریک بچھانے کی کوشش میں تھی لیکن بستی کے لوگ اس کے خلاف کھڑے ہوئے تو انگریزوں نے یہ دیکھ کر کچھ عرص کام روکے رکھا مگر جب دیکھا کہ بستی کے لوگ کسی صورت بھی پیچھے نہیں ہٹ رہے تو انگریز انتظامیہ نے ایک رات آپریشن کر کے قبرستان کو مسمار کر دیا اور جو جو اس کی رہ میں آیا اس کو قتل کر دیا۔یعنی کے قبرستان کو بچانے والے خود قبروں میں چلے گئے۔

> "آدم واہن میں ہونے والے آپریشن نے محض ایک قبرستان اکھیڑ کر بستی کے ہر گھر میں قبرستان بنا دیا تھا۔ بستی میں امن کی خبریں رکھنے والوں کو گمان بھی نہ تھا کہ بیس لاشیں تو ان جوانوں کی دفن ہوئیں جو گورے فوجیوں کی حملہ آوری کا نشانہ بنے لیکن ان سے ہٹ کر بھی وہ کون سا گھر تھا کہ جس کے وڈکوں اور اقربا کی مدفون لاشیں ایک ذلت آمیز مہاجرت کا شکار نہ ہوئی ہوں۔انگریز انتظامیہ کے حکیم پر بستی کی شمال مغربی سمت میں ایک نیا قبرستان تو کسی تعمیلی پروانے کی طرح وجود میں آچکا تھا مگر وہاں از سر نو دفن کی گئی لاشوں کی باقیات، زیر زمین ھینک دے جانے کے باوجود غیر مدفون تھیں کھلے آسمان کے نیچے بکھری ہوئی موت کی طرح تسور ہی نہیں تھا کہ ان کے اپنوں کے بعد از مرگ ٹھکانوں کی اس طور بھی اکھاڑ پچھاڑ ہو سکتی ہے۔یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بستی والے اپنے ماضی سے جبراً بے دخل کر کے اپنے زمانہ حال میں پھینگ دے گئے ہیں۔ان کے آبا کی قبروں کی کشائی کیا ہوئی، بستی والوں کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی"۔[29]

کرک ناتھ:

محمد حفیظ کا یہ ناول وطنِ عزیز میں موجود اشرافیہ کی سیاہ کاریوں کی روداد بیان کرتا ہے۔اس ناول میں سیاسی، سماجی معاشی اور معاشرتی وجوہات اور اثرات کا عکس پیش کیا گیا ہے۔ ناول کے نام سے ہی کہانی پوری طرح ذہن کی سطح پر اتر آتی ہے۔ "کرک ناتھ" ایک سیاہ رنگ کا مرغ ہوتا ہے جس کا خون، ماس اور ہڈیاں تک سیاہ ہی ہوتی ہیں۔اس لیے

ہمارے سماج میں موجودہ سیاہ چہروں کو پیش کرنے کے لیے ناول کا نام ہی کافی ہے۔ یہ ناول موجوہ عہد کے سیاہ ترین المیوں کا عکاس ہے۔اس ناول سے جڑا ہر کردار از خود وجود میں نہیں آتے بلکہ انھیں سماج کا ظالم اور مفاد پرست طبقہ تخلیق کرتا ہے اور اپنے مفاد کے لیے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتا ہے۔اس کی کہانی میں اشرافیہ کی پاور پلے، جنسی تشدد، قیدیوں سے امتیازی سلوک، سوشل میڈیا کے ذریعے خواتین کی عزتوں سے کھواڑ سمیت کئی جگر سوز واقعات کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ طاقت ور طبقے کے حصول کے لیے استعمال ہونے والے ہر طرح کے سیاہ ترین ہتھکنڈوں کا استعمال دکھایا گیا ہے۔ کرک ناتھ ہمارے سماج کا آئینہ ہے، جس میں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے منفی استعمال نے ہماری نوجوان نسل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، جس کی وجہ سے جنسی بے راہ روی سمیت کئی امراض ہمارے سماج میں جنم لے رہے ہیں۔ ناول پوری زندگی کی عکاسی کرتا ہے اس لیے محمد حفیظ نے صرف ایک پہلو پر نہیں بلکہ زندگی کے ہر ایک پہلو کو سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔اس کہانی میں ہم جنس پرستی، بد عملی، قیدیوں کے ساتھ امتیازی سلوک، سماجی ناانصافی اور پولیس گردی جیسے کئی مظالم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول نگار فرضی کرداروں کے ذریعے ہمارے ملک میں ہونے والے ہر مظالم اور سماجی ناانصافی کو خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔

ناول کا آغاز زفیرہ احمد اور مبشر رضا کے کرداروں سے ہوتا ہے۔ زفیرہ احمد اس ناول کا ایک اہم کردار ہے جو ایک بڑے بزنس مین کی بیٹی ہوتی ہے۔ زفیرہ احمد والد کی وفات کے بعد کمپنی کی چیف ایگزیکیٹو بن جاتی ہے اور اپنی پیشہ وارنہ تعلیم کی وجہ سے کمپنی کو آسمان کی بلندوں تک لے جاتی ہے۔ زفیرہ احمد کے حسن کی وجہ سے اس سے بڑے صاحب جیسے کئی افسران خلوت کا تقاضا کرتے مگر وہ سب کو ٹال دیتی ہے۔ کیونکہ اس کی فطرت میں مرد سے بیزاری موجود ہے اور وہ مرد کی بجائے اپنے کتے کو خلوتوں کا دوست بناتی ہے۔اشرافیہ جیسے طبقے سے تعلق ہونے کی وجہ سے زفیرہ احمد بھی جانوروں کے ساتھ جنسی لطف کشید کرنے کی بیماری میں مبتلا ہوتی ہے۔

دوسرے ممالک اور ہندستان کی فحش نگاری کی تاریخ میں تین دہائیوں سے مختلف قسم کے جانوروں کے ساتھ جنسی سرگرمیاں جاری ہیں مگر پاکستان میں اشرافیہ کے طبقے سے تعلق رکھنے میں یہ بیماری بہت حد تک بڑھ چکی ہے۔ فاروق بلوچ ایک مضمون میں بیان کرتے ہیں۔

> "جانوروں کی طرف جنسی رغبت یا ان کا استعمال کرنے والوں کے نفسیاتی تجزیہ کے دوران معلوم ہوا کہ یہ لوگ جسمانی اور جنسی عدم استحکام، جذباتی اور جنسی ناپائیداری، جذباتی لگاؤ میں دشواری، کم خود اعتمادی جیسے مسائل کا سامنا کرتے ہیں، جبکہ بچپن میں برے معاشرتی سلوک کا بھی سامنا کیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ حوصلہ افزائی کے بھوکے،

طمانیت کی تسکین میں تاخیر برداشت نہ کر سکنے والے جارحیت پسند ہوتے ہیں۔ جبکہ ان کی اکثریت نظم وضبط کو پسند نہیں کرتی۔"30

زفیرہ احمد اپنے شونی (کتے) کے ساتھ جنسی تعلقات وطنِ عزیز کے طبقہ اشرافی میں جنسی آزادی کی بدترین مثال ہے۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس کلاس یعنی طبقے میں مرد، عورت کو بطور ایک جنس یا ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے وہاں کی عورت پھر مردوں کو کتا اور کتوں کو مرد کا مقام دے دیتی ہیں۔

"اس روز بھی وہ اپنے فارم ہاؤس میں انتہائی تنے ہوئے اعصاب اور دہکتے ہوئے طیش کے عالم میں پہنچی تھی۔اسے دیکھتے ہی شونی دوڑا ہوا آیا اور اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔زفیرہ نے خلاف معمول اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر لپٹانے کی بجائے محض جھک کر اس کی گردن اور کمر پر ہاتھ پھیرا اور انتہائی بے تابی سے سیدھی اپنے لائبریری روم کے ایک کونے میں بنی ہوئی بار کے پاس پہنچی اور بلیک لیبل کا ایک ڈبل پیک بنا کر برف ڈالے بغیر ایک لمبا سا گھونٹ اس طرح لیا کہ اس کا حلق محسوس کیے جانے کی گہرائی تک خوشگوار تلخی سے سیراب ہوتا چلا گیا۔وہسکی کا اگلا گھونٹ لینے تک وہ اچھی بھلی پر سکون ہو چکی تھی۔ شونی بھی دبے قدموں کمرے میں آیا اور چوبی فرش پر بیٹھ کر زفیرہ کی طرف استفساریہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔زفیرہ نے اس کی آنکھوں کا پیغام پڑھ لیا اور مسکرادی۔شونی ایک دم اٹھا اور محبت آمیز بے تکلفی سے اس کے قریب جا کر اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔"یہ مرد ایسے کیوں نہیں ہوتے؟"شونی کی لجاجت بھری محبت دیکھ کر اس کے ذہن میں مبشر رضا کا چہرہ ابھر آیا۔"31

مبشر رضا زفیرہ احمد کی کمپنی میں کاپی رائٹر ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے ہی زفیرہ احمد کی کمپنی بام عروج تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔اچانک ایک دن مبشر رضا کہیں گم ہو جاتا ہے اور کئی دن گزر جاتے ہیں اس کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا۔زفیرہ احمد کاروبار کو نقصان کی طرف جاتا دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے اور اپنے کاروبار کو بچانے کے لیے بڑے صاحب سے مدد لینے کا سوچتی ہے۔جب زفیرہ احمد بڑے صاحب کو فون کر کے مبشر رضا کے متبادل تلاش کرنے کا کہتی ہے تو پہلے سے ہی زفیرہ احمد کے وصال سے محرومی کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔وہ زفیرہ احمد کو لالچ دیتا ہے کہ آپ کو دوسری کمپنی کا کاپی رائٹر توڑ کر دوگا مگر اس شرط پر کہ ایک تو مجھے کمپنی کے اکیاون فیصد کا شیئر کا حصہ دار بناؤ اور دوسرا کل شام میری فارم ہاؤس پر آ کر میرے بستر پر ایک رات گزارو۔زفیرہ احمد غصہ کر کے فون بند کر دیتی ہے۔لیکن دوسرے دن کاروبار کے نقصان کی فکر اس کو پھر سے بڑے صاحب کو فون کرنے پر مجبور کرتی ہے۔وہ بڑے صاحب

کو فون پر کہتی ہے کہ مجھے ایک شرط منظور ہے میں کل شام کو آپ کے فارم ہاؤس پر پہنچ جاؤ گی اور دوسری بات اکیاؤن فیصد شیئر کی وہ میں آپ کو نہیں دے سکتی ہوں۔ بڑا صاحب زفیرہ احمد کو اپنے فارم ہاؤس پر آنے کا وقت بتا دیتا ہے۔ جیسے ہی زفیرہ احمد بڑے صاحب کے فارم ہاؤس پہنچتی ہے تو بڑا صاحب اکیاؤن فیصد شیئر نا ملنے کے غصے میں اس سے اس طرح انتقام لیتا ہے کہ زفیرہ احمد کاروبار کو بچانے کے ساتھ ساتھ اپنی عزت بھی خاک میں میلا بیٹھتی ہے۔ بڑا صاحب زفیرہ احمد کی سیکس وڈیو بنا کر ان کو انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر شیئر کر دیتا ہے۔ اس واقع سے زفیرہ احمد کے حریفوں کو مزید موقع مل جاتا ہے اس کو ذلیل کرنے کا۔

یہاں سے یہ بات واضع ہوتی ہے کہ زفیرہ احمد معاشی تعصب کا نشانہ بنی ہے اور دوسرا صنفی امتیاز کا بھی۔ معاشی تعصب کا اس لیے کہ اس کی کمپنی ملک کی سب بڑی کمپنی تھی تو بڑا صاحب اس کمپنی کا حصہ دار بنا چاہتا تھا اور دوسرے مخالفین زفیرہ احمد کی شہرت دیکھا کر اس کی کمپنی کو نقصان پہنچانے کے لیے کوشش میں رہتے تھے۔ اب یہاں مبشر رضا کی اچانک گم شدگی اور بڑے صاحب کی طرف سے زفیرہ احمد کو بے ابرو کرنا یہ سب کچھ معاشی تعصب کی طرف اشار کر رہا ہے۔ اور صنفی امتیاز اس لیے کہ ہمارے سماج میں صرف مرد کو ہی کامیاب بزنس مین سمجھا جاتا ہے ۔ یعنی کے ہمارے سماج کے اندار عورت کو کاروبار کرنے نہیں دیا جاتا اور اگر وہ کاروبار کرتی ہے تو اس کی راہ میں مرد رکاوٹ بنتے ہیں یعنی اس کی عزت پر حملہ آور ہو کر اس کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے اس ناول میں زفیرہ احمد کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے ہمیں ایک کردار کے ذریعے اہم سماجی برائیاں دیکھانے کی کوشش کی ہے۔ کتوں سے رغبت کا سبب بھی مرد کا سماجی جبر بنتا ہے کہ وہ عورت کو کھلونا سمجھ کر اس کے جذبات و احساسات کو سمجھتے ہیں نہ سمجھنا چاہتے ہیں۔

اس ناول میں مبشر رضا کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو کہیں پر کاشف، تو کہیں مبشر رضا کے نام سے پہچانا جاتا ہے تو کہیں نیئر جمیل تو کہیں سردار محبوب کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ انسان ایک مگر حالات اور وقت کے ساتھ وہ اپنے نام تبدیل کرتا رہتا ہے۔ بچپن میں اس کا نام کاشف ہوتا ہے جب وہ شبیر کو لاہور میں ملتا ہے اور شبیر کا ایک اچھا دوست بنا جاتا ہے۔ یہ دونوں اس وقت لاہور کے ہوٹلوں میں روم سروس کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ایک دن ان سے اتفاقاً ایک انسانی جان کا قتل ہو جاتا ہے اور یہ وہاں سے پھر سریل کلر بن جاتے ہیں۔ آخر کار ایک دن تینتالیس افراد کے بن کر جیل چلے جاتے ہیں۔ جیل میں پہلے تو ستر قیدیوں کے ہاتھوں امتیازی سلوک کا نشانہ بنتے ہیں اور پھر رحمت خان کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ رحمت خان جو اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے وہ جیل کے اندر ایک شاہانہ زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے اور اس کی کوئی اولاد نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کاشف عرف کاشی اور شبیر عرف شاکا کو اپنا وارث بنا لیتا ہے اور ان دنوں کو جیل کے اندر تعلیم حاصل کرنے پر راغب کرتا ہے۔ جب کاشف اور شبیر جیل سے رہا ہو کر باہر

آتے ہیں تو شبیر شاکے کی بجائے دانش سعید ولد رحمت خان بن جاتا ہے اور کاشی بی اے کرنے کے باوجود جرائم کی دنیا میں واپس چلا جاتا ہے۔ کاشف کی بجائے کبھی مبشر رضا، کبھی نیئر جمیل اور کبھی سردار محبوب بن کر اپنی تسکین کا سامان کرتا رہتا ہے۔

زفیرہ احمد کے ساتھ کاشف مبشر رضا کے روپ میں پیش آتا ہے۔ مبشر رضا کاپی رائٹر کے طور پر کام کرتا ہے اور کمپنی کا کاروبار اپنی باکمال تخلیق سے بام عروج تک لیے جاتا ہے۔ مبشر ایک نفسیاتی حادثے کا شکار نظر آتا ہے وہ عورت ذات سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ اس کی نفرت کا اظہار کرنے کے لیے وہ عورت کو ہر صورت میں اپنے حصار میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح صورت کے پیچھے وہی عوامل کار فرما ہوتے ہیں جو ایک نارمل انسان کو ابنارمل بنا دیتے ہیں۔ اس طرح یہاں مبشر رضا کو ایک نفسیاتی فرد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

> "نسوانی وجود سے کراہت کی حد تک بیگانگی کے باوجود وہ اپنے آس پاس کی ہر جوان لڑکی کو اپنی کامل دسترس میں رکھنا چاہتا ہے، کچھ اس طرح کہ وہ اس کی نہ ہوتے ہوئے بھی صرف اسی کی ہو کر رہے۔ سانس بھی لے تو اس کی رضا سے اور زندگی کرے تو اس کی منشا کے تحت اسی کی ڈھب پر۔ بہ ظاہر ایسا بھی نہیں تھا کہ محض قبول صورت ہوتے ہوئے بھی اس میں مردانہ وجاہت کی کہیں کوئی کمی رہی ہو مگر اپنی طرف کھچی چلی آنے والی ہر حسینہ سے کھچا کھچا رہنا اس کا وتیرہ ہو چلا تھا۔"[32]

اگر مبشر رضا کی تخلیق کی بات کریں تو اس میں بھی صرف عورت ہی نظر آتی ہے۔ وہ جس بھی کمپین کا اشتہار ڈیزائن کرتا تھا اس میں عورت موجود ہوتی تھی یعنی وہ اشتہار عورت سے شروع ہو کر عورت پر ہی ختم ہوتا تھا۔ مبشر رضا کے رویے کو یوں بیان کیا گیا۔

> "اس کے ناقدین کے نزدیک نسائی خبط میں مبتلا وہ ایک ایسا جنونی تھا کہ جس کی تخلیقی صلاحیتیں عورت کے وجود میں مقید اور اس کی چشم ہنر عورت کے بدن کے زاویوں سے آگے دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔"[33]

مبشر رضا کی یہ ساری کیفیات کی وجہ سیاسی، مذہبی اور سماجی ہی ہو سکتی ہے کیونکہ ان میں کسی ایک کے زیر اثر وہ نفسیاتی مرض میں مبتلا ہوا ہے۔ مبشر رضا کا کردار سوچنے و سمجھنے والوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

اس ناول میں ایک اور اہم کردار دانش سعید کا ہے جس کو حالات شبیر سے شاکا اور شاکا سے دانش سعید بنا دیتے ہیں۔ بچپن کے دنوں میں جب اس کا نام شبیر ہوتا ہے۔ اس کا تعلق ایک غریب گھر سے ہوتا ہے۔ شبیر کا باپ غربت

کے ہاتھوں تنگ آکر مزدوری کے لیے غیر ملک چلا جاتا ہے۔ باپ کے جانے کے بعد شبیر کی ماں ماموں زاد روشن سے جنسی تعلقات بنالیتی ہے۔ شبیر کے باپ کی بیرون ملک سے آنے والی کمائی سے اس ماں دو مکان تیار کروالیتی ہے۔ ایک اپنے لیے اور دوسرا باقی گھر والوں کے لیے (شبیر کے دادا ودادی وغیرہ کے لیے)۔ وہ اپنے گھر میں ماما روشن کو ساتھ رکھتی ہے۔ جس کی وجہ شبیر اس فکر میں مبتلا رہتا ہے کہ شام کو ہم سے دور سونے والا ماما روشن رات کے وقت اس کی ماں کے ساتھ کیا کرنے آتا ہے۔ وہ سات آٹھ سال کا شبیر جس کی جب کبھی رات کو کسی پہر آنکھ بیدار ہوتی ہے تو یہ سب دیکھ کر سوچتا ہے۔

> "رات گئے اگر کوئی آنکھ کھلتی اور پھر حیرت سے کھلی ہی رہتی تو وہ ساتھ آٹھ برس کے شبیر کی ہوتی۔ وہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ شام کو الگ چارپائی بچھا کر قدرے دور سونے والا ماما روشن باقی کی رات اس کی ماں کے ساتھ کیوں سوتا ہے اور کیسی کیسی عجیب حرکتیں کرتا ہے۔"[34]

شبیر کا رات کے وقت نیند سے بیدار ہونا، ماما روشن اور اسکی ماں کی خلوت میں خلل ڈالتا ہے تو شبیر کی ماں ماما روشن سے کہتی ہے کہ افیم کی کنی خود بھی لگالیا کر اور تھوڑی سی شبیر کو بھی دے دیا کرے تاکہ وہ رات کو نہ جاگ سکے۔ دوسرے دن ماما روشن شبیر کو افیم یہ کہہ کر کھلا دیتا ہے کہ یہ دوائی کھالو آگے سردیاں آرہی ہیں نزلہ زکام وغیر نہیں لگے گا۔ شبیر کے افیم کھانے یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے روز صبح کو کافی دیر سے بیدار ہوتا ہے۔ جب شبیر نیند سے جاگتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ماں کی چارپائی ٹوٹی ہوئی ہوتی مگر ماں چہرے پر غصے کی جگہ آج خوشی ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ چھوٹے سے نقصان پر سارے گھر کو سر پر اٹھانے والی ماں آج اتنے بڑے نقصان پر خوش کیوں ہے؟۔ شبیر زیادہ دیر سونے کی وجہ سکول بھی دیر سے پہنچتا ہے تو وہاں ماسٹر صاحب سے مار پڑتی ہے۔ اس طرح کچھ روز ایسے ہی ماما روشن شام ہوتے ہی شبیر کو افیم کی کھلا دیتا ہے اور شبیر صبح کو کافی دیر تک سویا رہتا ہے۔ شبیر کو یہ بات بھی فکر مند کرنے لگتی ہے کہ وہ تو صبح کو جلدی اٹھنے والا تھا یہ کیا ہو گیا روز نہ اتنی دیر تک کیوں سویا رہتا ہوں۔ کہیں یہ ماما روشن کی دوائی کی وجہ تو نہیں ہے۔ یہ سوچا کر ایک دن وہ ماما روشن سے افیم لیے کر کھاتا نہیں ہے اور پھر رات کو اپنی ماں اور ماما روشن کو بغیر لباس کے دیکھا کر حران ہو جاتا ہے۔ ماں اور ماما روشن کی رات بھر کی برہنہ حرکتیں سات آٹھ سال کے شبیر کے ذہن پر بہت سے سوالات پیدا کرتی ہیں۔ شبیر صبح کو نہاتے ہوئے اپنے جسم کا تقابل ماما روشن سے کرتا ہے۔ پھر جب سکول جاتے ہوئے رستے میں نظر آنے والے شخص کا بھی تقابل ماما روشن سے کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ سب ماما روشن کی طرح ہوں گے اگر ایسا ہے تو وہ خود ان جیسا کیوں نہیں ہے۔ سکول پہنچ کر سارا دن ماسٹر صاحب کو بھی یہی سوچ کے تکتا رہتا ہے اور

ماسٹر صاحب کچھ اور سمجھ کر اس کو چھٹی بعد روک لیتا ہے۔ یوں ماسٹر صاحب کے ہاتھوں پہلی بار شبیر کا جنسی استحصال ہوتا ہے۔

"مغرب سے کچھ دیر پہلے ماسٹر نے اسے گھر جانے کی اجازت دی تو اس سے اپنے قدموں پر چلا نہیں جا رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کی کسی کو نہ بتانے کی دھمکی اپنی جگہ مگر آج ایک بہت بڑے جہان کا چھوٹا سا حصہ بن کر شبیر بہت خوش تھا۔ اس پر وہ سارے راز کھل چکے تھے جو آج سے پہلے گرہوں کے اندر گرہیں ڈال کر اس کے ذہن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آج کے بعد اسے کسی مرد کے جسم کا تقابل ماما روشن کے جسم سے کرانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے ننھے سے ذہن پر آشکار ہو چکا تھا کہ سر شام کہیں دور چارپائی پر سونے والا ماما روشن پوری شب اس کی ماں کے ساتھ کیوں سوتا ہے اچارپائی ٹوٹنے کے نقصان پر غصہ کرنے کی بجائے اس کی ماں ماما روشن کو دیسی گھی کے پراٹھے پر مکھن اور شکر ڈال کر کیوں کھلاتی ہے۔"[35]

جب شبیر ماسٹر صاحب کے ہر روز کے جنسی تشدد سے تنگ آیا تو اس نے سکول چھوڑ کر ایک گاموں نامی لوہار سے کام سیکھنے جا بیٹھتا ہے۔ وہاں پر شبیر کے ساتھ گاموں لوہار بھی وہی کرنے لگا جو ماسٹر صاحب کرتا تھا مگر گاموں ماسٹر صاحب کی طرح رویہ نہیں رکھتا تھا۔ گاموں لوہار کے نرم رویے نے شبیر کے پر پرزے نکل آتے ہیں اور اپنے سے چھوٹے بچوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتا ہے۔ پھر حالات شبیر کو لاہور لے آتے ہیں۔ لاہور میں شبیر منڈا منڈی کا ایک فعال رکن بن جاتا ہے۔

یہ وہ نفسیاتی، جذباتی اور سماجی ٹوٹ پھوٹ ہے جو شبیر کو ایک ڈاکو اور قاتل بنا دیتی ہے۔ وہ نہ ایک عام انسان کی طرح جی سکتا ہے نہ ہی کسی کو جینے دیتا ہے۔ خاص طور اپنی ماں کے رویے کو دیکھ کر، جو اپنی جنسی بھوک کو مٹانے کی خاطر بیٹے کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی ہے۔ والدہ، جو بچے کے لے سب کچھ ہوتی ہے۔ جب وہ ہی اپنے پیار سے بچے کو محروم کر دے، تو پھر وہ بچہ شاکا بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسرا استاد جس کو روحانی باپ کا درجہ حاصل ہے جب وہ اپنے طالب علم کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا تو بچوں کا مستقبل شبیر کی زندگی سے اندازہ کر لیں کہ کیسا ہو گا۔ محمد حفیظ کے ان کرداروں (کاشف اور شبیر) کی طرح شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" کے کردار راجہ، شامی اور نوشا بھی سماجی جبر کے نمائندہ ہیں۔

ماہین نامی لڑکی بھی اس ناول کا ایک کردار ہے جس کا مہذب گھرانے سے تعلق ہوتا ہے۔ماہین ایم فل کمیسٹری کی اسوڈینٹ ہوتی ہے اور وہ مذہبی ماحول کی وجہ سے یونیوسٹی میں خود کو سر سے پاؤں تک ڈھک کر رکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے اسکے کلاس فیلوز اس کا مزاق اڑاتے ہیں اور غلظ قسم کے جملے بکتے ہیں۔ماہین کو رات کے وقت یونیوسٹی کے لڑکوں کے وہ جملے یاد آتے ہیں اور اس کے بدن میں بے قراری پیدا ہونے لگتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ سوشل میڈیا پر لڑکے تلاش کر کے ان سے دوستی کرنے لگ جاتی ہے۔ سب پہلے وہ جمال احسن نامی شخص سے دوستی کرتی ہے اور اس کے ساتھ میسنجر پر بات کرتے کرتے فون کالز پر آجاتی ہے۔

> "ایک رات جمال احسن نے اسے رات کے تیسرے پہر ایک ایسے ذائقے سے آشنا کر دیا کہ جو موبائل فون کی دوسری جانب بولے ہوئے آتش صفت لفظوں سے اس کے رگ وپے میں اترتا اور پھر اسے چکی کے دو پانوں کے درمیاں باریک سا پیستا ہوا دھیرے دھیرے اس نہج تک لے جاتا جہاں اس کا پورا جسم دھوئے ہوئے کپڑے کو مروڑنے کے سے انداز میں اپنے اندر ہی نچوڑ کر اس طرح کی لذت کشید کرتا جسے کسی نام کا دیا جانا نہ تو ممکن تھا اور نہ ہی اس کے بس میں۔"[36]

اس طرح ماہین جو بہت ہی مہذب اور شرمیلی ہوتی ہے اس کو جمال احسن جنسی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے اس مقام پر لے آتا ہے کہ ماہین خود سے سکائپ پر بے لباس ہونے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ مگر جمال احسن اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے تو ماہین اس پر غصہ ہو کر اس سے تعلق ختم کر دیتی ہے۔جمال احسن کے بعد اسکا ایک دو ایسے لڑکوں سے واسطہ پڑتا ہے جو اسے دن رات پریشان کرتے رہتے ہیں۔ماہین بڑی مشکل سے ان سے جان چھوڑاتی ہے اور پھر سے ایک نئے دوست کی تلاش میں لگ جاتی ہے۔ چند دن بعد ماہین کی دوستی نوید نامی لڑکے سے ہو جاتی ہے اور وہ ماہین کو لطف وانبساط کی ایسی منزل پر لیے آتا ہے کہ ماہین سکائپ کے ذریعے برہنہ صورت میں اس کے سامنے آنا شروع کر دیتی ہے۔ماہین کی جس خواہش سے جمال احسن انکار کیا تھا نوید نے اس خواہش کو خوش دلی سے پورا کرنے کی ازجات دی۔ماہین اپنی خواہش کے جال میں اس طرح پھنسی کہ زندگی اس کے لیے ایک بھیانک خوب بن گی۔

ماہین اپنی مرضی سے بنائی ہوئی برہنہ ڈویوز کی وجہ سے نوید کے ہاتھوں بلیک میل ہونے لگتی ہے۔نوید ماہین کو اسلام آباد کے ہوٹل میں ملنے کا کہتا ہے تو ماہین اسے انکار کرتی ہے تو نوید ماہین کا انکار سنتے ہی اس کو سکائپ سے ریکاڈ کیا گیا ایک ویڈیو کلپ بھیج دیا۔ جس میں ماہین نیم برہنہ حالت میں خود لذتی کے عمل سے گزر رہی ہوتی ہے۔نوید مزید دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ تو صرف نمونہ ہے اگر ملاقات کے لیے ہوٹل پر نہ آئی تو میں ایسی سب ریکاڈنگز یوٹیوب پر اپ لوڈ کر دوگا۔

"ہر آنے والے دن کے ساتھ ہی نوید کا مطالبہ زور پکڑتا جارہا تھا۔ اب تو اس نے واضح طور پر کہنا شروع کر دیا کہ وہ اسے بس ایک بار ملے، اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق پھر وہ واپس چلا جائے گا کبھی نہ تعلق رکھنے کے وعدے کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ ماہین کے پاس اس کا کوئی مثبت جواب نہیں تھا اس لیے اس کے رد عمل میں نوید کا مطالبہ طیش میں بدلتا چلا گیا۔ ماہین کے لیے یہ امر بھی مسلسل تشکیک کا باعث تھا کہ اگر نوید واقعی دوبئی میں رہتا ہے تو ادھر اسلام آباد میں اتنے دنوں سے کیا کر رہا ہے؟ کیا اس نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا کہ وہ دوبئی میں رہتا ہے؟ ابھی وہ اس مخمصے سے نکل نہیں پائی کہ نوید نے ایک اور چال چلی۔ اس نے سکائپ سے ریکارڈ کیا گیا ایک ویڈیو کلپ ماہین کو بھجوادیا کہ جس میں وہ نیم برہنی حالت میں خود لذتی کے عمل سے گزر رہی تھی۔ نوید کا کہنا تھا کہ یہ تو محض نمونہ ہے۔ اب بھی اگر اس نے ملاقات نہ کی تو وہ اس قسم کی ڈھیروں ریکارڈنگز یوٹیوب پر ڈال دے گا اور پھر اس کے بعد جو ہوگا، اس کا تصور وہ خود ہی کر لے تو بہتر ہوگا۔"[37]

ماہین اس خوف سے نوید سے ملاقات کے لیے راضی ہو جاتی ہے اور اس سے ہوٹل کا پتہ معلوم کر کے گھر سے نکل آتی ہے۔ اس دن ماہین یونیوسٹی نہیں جاتی بلکہ نوید کے پاس ہوٹل پر ملنے آجاتی ہے۔ جب ماہین ہوٹل پر نوید کے پاس پہنچتی ہے تو نوید وصال سے پہلے ہی زیادہ مقدار میں وایاگرہ لینے پر اسے ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ نوید کے مرتے ہی ہوٹل کا ملازم طیفا اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ماہین کو پہلے بے آبرو کرتا ہے پھر پولیس کو نوید کے قتل کی خبر دے کر الزام ماہین کے سر لگا دیتا ہے۔ ماہین نے گھر پہنچ کر یہ کہانی کچھ اس طرح سے بتائی کہ یونیوسٹی سے آتے ہوئے رکشا الٹ گیا، وہ رکشے سے باہر گری تو ایک موٹر سائیکل والے نے اس کی تانگوں پر سے گزار دی جس کی وجہ سے گوشت چتھڑ گیا ہے۔ یہ بات کرتے ہی ماہین اپنے کمرے میں چلی گی اور وہاں بیٹھ کر اپنے ساتھ ہونے والے جنسی تشدد کا جواز تلاش کرنے لگی۔

"ماہین کو اپنے ذہن سے عصمت دری جیسی سماجی کالک پونچھنے کا جواز ملا تو اسے اپنے جسم سے ہونے والی کراہت کا احساس بھی ماند پڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ایک نئی تاب کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنسو خشک ہوئے تو وہ ساری امنگیں پھر سے بیدار ہونے لگیں کہ جو نارمل زندگی کے تقاضوں سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن سماج کی جکڑ بندی میں آئے ہوئے شعور کو ابھی کچھ اور تشفی نما جواز چاہیے تھے۔" کیا کوئی ایسا مرد جو کسی عورت کی خلوت میں اگرچہ جبراً دراندازی کا مرتکب ہوا ہو مگر اسے تلذذ کی ہر ممکن معراج تک

پہنچانے کا اہل پایا گیا، اس مرد سے بہتر نہیں کہ جو رجوع تو عورت کی منشا سے کرے مگر اس سارے عمل کو اپنی کم ہمتی اور نااہلی سے مکدر بنا کر رکھ دے؟" ماہین نے اس سوال کا جواب ہر زاویے سے نہ صرف اپنے سے کیا بلکہ اپنے جسم، اپنے جذبات اور اپنے ذہن سے کیا لیکن ہر بار اسے، ہر چوکھٹ سے اس کا جواب اثبات میں ملا۔"[38]

جب پولیس ماہین کو گرفتار کرنے کے لیے ادھی رات کو اس گھر پہنچتی ہے تو ماہین کے ماں باپ اپنی سماجی تذلیل کے خوف سے پولیس والوں سے یہ بات بھی نہ پوچھ پائے کہ ان کی بیٹی کو کس جرم میں پکڑ کر لے جا رہے ہو۔ ماہین کے والدین نے وہی کیا جو ایک مڈل کلاس کے شریف لوگ کرتے ہیں جو اپنی غیرت کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ ماہین کے ولدین نے رات کی تاریکی میں اپنی بیٹی کو خاموشی کے ساتھ پولیس کے حوالے کر دیا اور پھر اس بیٹی کے لیے تھانے تک نہیں گئے۔ ہمارے سماج کے مڈل کلاس کا شریف طبقہ اپنی نام وری کی خاطر اپنے خون پر بھی رحم نہیں کرتے ہیں جیسے ماہین کے ماں باپ نے کیا کہ اپنی بیٹی کی مڑ کر خبر بھی نہیں لی۔ جب پولیس نے دیکھا کہ ماہین کے گھر سے کوئی بھی شخص اس کا والی وارث نہیں ہوا تو ماہین بے گناہ ہونے کے باوجود پولیس کے نجی ٹارچر سیل میں عزت و عصمت گنوانے کے ساتھ بے پناہ تشدد کو برداشت کرتی رہی۔ پولیس والوں کی طرف سے جو مظالم ماہین پر ہوئے ہیں، انہیں دیکھا کر انسان کے دل ہی نہیں دماغ شدید صدمے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پولیس کے روپ میں رمضان، الیاسا، کالا ، شادا، رستم اور ذیشان جیسے بھیڑیوں نے ماہین کی عزت و عصمت کو یوں ملیامیٹ کیا کہ وہ جذباتی اور نفسیاتی طور ایک خاتون نہیں رہتی ہے۔ پولیس اسے اس قابل رہنے ہی نہیں دیتی کہ وہ عام شہری کی طرح زندگی گزار سکے۔ ماہین کے پس پردہ ہمیں پولیس گردی میں ایسے سیاہ کردار دیکھے گئے ہیں جو معصوم اور بے گناہ انسانوں کی زندگیاں تباہ کرتے ہیں۔ یہاں پولیس اعلیٰ طبقے کے مجرموں کو سزادے کر انھیں سماج میں نشان عبرت بنانے کی بجائے مڈل کلاس طبقے کے بے گناہ اور معصوم لوگوں کو زبردستی سزا دینے اور مجرم بنانے میں مصروف رہتی ہے۔ جیسے ماہین کے ساتھ کیا اس کو نفسیاتی طور پر مفلوج کر دیا۔

"اس نے بہت ہی کم دنوں میں اتنے زیادہ ٹھکانے اور اتنے زیادہ مرد بدلے کہ اسے عورت کے مزج میں دخیل پردیسی پن اور عدم تحفظ کی وجوہات سمجھ میں آنے لگی تھیں۔"[39]

ماہین کا کردار ناول میں انفرادی طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن یہ حقیقت میں ہمارے پولیس سسٹم پر سوالات اٹھاتا ہے کہ جس کے جوابات کے لیے حکومت اور معاشرے کے افراد کو مل بیٹھنا پڑے گا۔ اس صورت حال میں ماں باپ کی طرف سے ہونے والی غفلت بھی سامنے آتی ہے جو اپنے بچوں کو موبائل اور انٹرنیٹ جیسی سہولت تو دیتے ہیں مگر ان سے یہ کبھی نہیں پوچھتے کہ وہ اس کا استعمال کس طرح کر رہے ہیں۔ اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے صنفی

اختیار کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں پولیس والے عورت ذات کے ساتھ تھانے یا جیل میں کیسا سلوک کرتے ہیں۔ وہ ایک ماہین کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

اس طرح مرد اور عورت، فرد اور سماج، استاد اور شاگرد، محافظ اور چور انسان اور جانور کے تعلقات کے بدلتے ہوئے معانی کو بیاں کرتا ہوا یہ ناول بعض مقامات پر عورت اور مرد کی نفسیات سمیت زندگی کے فلسفہ و فکر کا بیانیہ بھی بن جاتا ہے۔

> "عزت مآب اور قابل احترام ہونا کچھ بھی نہیں، محض تصوراتی القابات ہیں اس وقت تک کے لیے جب تک آپ اپنے ڈھب سے جینے کی بجائے سماجی ضابطوں کے قیدی ہو کر رہتے ہیں۔ عزت آبرو اور پندار کا تصور سماج کے خوف سے جڑا ہوا ہے جب کہ آبرو باختگی اور مذلت سماج کے خوف سے مکتی پا لینے کی کیفیات ہیں۔ کیسے کیسے عذابوں کے وسیلے سے معاشرہ اپنے اس خوف کو نافذ کیے رکھنے کا جتن کرتا رہتا ہے کیوں کہ سماج کے کرتا دھرتا جانتے ہیں کہ ایک بار یہ خوف کسی کے ذہن سے نکل گیا تو پھر واپس آنے کا نہیں۔ یہ خوف کسی فرد کو جاننے ہی نہیں دیتا، سمجھنے ہی نہیں دیتا کہ ذلیل و رسوا سمجھے جانے والے سماج کے باغی اس خوف سے نجات پا کر کس قدر مزے میں ہیں۔ کم از کم اپنی زندگی تو خود جی رہے ہیں۔"[40]

طاقت ور طبقہ اپنی مضبوطی اور مفادات کی حفاظت کی خاطر عورت ذات کو استعمال کرتا ہے۔ عورت کو سماج میں بطور انسان ماننے سے انکار یہ بات واضح کرتا ہے کہ آج بھی ہمارا معاشرہ ویسے ہی ہے جیسے آج سے چودہ سو سال پہلے کا معاشرہ تھا۔ جس طرح اس زمانے میں لوگ اپنی بچیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفنا دیتے تھے ویسے ہی موجود عہد میں اسی ذہن کے لوگ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اپنی بیٹیوں کی عزت، عصمت اور زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

اس ناول کے نسوانی کردار ماہین اور کلثوم، جو ابھرتی ہوئی جوانیاں ہیں، جذبوں اور احساسات میں تازگی و توانائی سے سرشار ہیں، اپنی سرشت اور فطرت میں معصوم اور بے گناہ ہیں، کرک ناتھ سماج کی منہ زور موجوں میں تنکوں کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ نسائی کرداروں میں زفیرہ احمد اور درخانئ کا کردار بھی ایسے ہی حالات کا شکار نظر آتا ہے مگر وہ دونوں استثنائی صورت میں اور طرح کی صورتحال کا سامنا کرتی ہیں۔

محمد حفیظ نے اس ناول کے ذریعے ہمیں یہ دیکھایا ہے کہ ہمارا معاشرہ اصل میں ویسا نہیں جیسا ہمیں کتابوں میں ملتا ہے۔ کتابوں میں پیش کیا گیا معاشرہ، سماجی انصاف، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی خوبصورتی میں اپنی مثال آپ

نظر آتا ہے لیکن ہمارے عہد یعنی موجودہ زمانے کا سماج مکمل طور پر ناانصافی، بد عملی، بد کرداری سمیت ہر اس برائی کا نمائندہ بن چکا ہے جو انسان کو انسان نہیں رہنے دیتا۔اس ناول میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ظلم کے بڑھنے پر مظلوم اس کے رد عمل میں بغاوت کرتا نظر آتا ہے۔ محمد حفیظ نے سماج میں ہونے والے جنسی تشدد، طاقت کے حصول کی دوڑ، ناجائز معاشی ترقی اور دیگر مذموم کاموں کا رد عمل اس طور پر پیش کیا ہے کہ سماج کی بنیادیں ہل کر رہ گئی ہیں۔ ناول نگار نے اشرافیہ کے شب و روز کو بہت قریب سے دیکھ چکا ہے،اس لیے اس کے بیانئے میں حقیقت کی عکاسی جاندار طریقے سے ہوئی ہے۔ اگرچہ ماہین کے والدین کا، پولیس چھاپے اور ماہین کی گرفتاری کے بعد اس کی رہائی کی کوشش نہ کرنا اور معاملے کی حقیقت نہ جاننا، ایک ایسے سماج میں کہ جہاں سوشل میڈیا تک جیسے طاقت ور ذرائع ابلاغ موجود ہوں، حیرانی کا سبب بنتا ہے تاہم سماج میں ایسے افراد کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں جو انا اور اپنی عزت کے سبب بچوں سے لاتعلقی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

محمد حفیظ نے اپنے سماجی شعور کے زندہ ہونے کی ایک مثال یوں بھی دی ہے کہ وقت کے ساتھ بدلتی زمانوی اور سماجی صورت حال جہاں ہمارے لیے سہولتیں پیدا کر رہی ہے خاص طور پر موبائل فون لیکن یہی سہولت ہمارے نوجوان نسل کی تباہی کا باعث بھی بن رہی ہے۔ انٹرنیٹ تک آسان رسائی نے بچوں اور بچیوں کو جنسی مریض بنا دیا ہے اور ہمارا سماج اس مشکل صورتحال سے نمٹنے کے بجائے اس سے کنارہ کش ہے۔ برائی کا رستہ روکنے کی بجائے اس سے آنکھیں پھیر لینا، اس برائی کو آگے بڑھنے کا راستہ دینا ہے۔ محمد حفیظ نے اس بیماری کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد معاشرتی مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے شوکت صدیقی نے ناول "خدا کی بستی" لکھا تو اس میں فرضی کردار راجہ، شامی اور نوشا کو بنیاد بنا کر پاکستانی سماج کے ہر طبقے کے افعال اور اعمال کی عکاسی کی۔ اس طرح محمد حفیظ نے موجودہ پاکستانی سماج اور نظام میں ہونے والی ناانصافیوں، جرائم اور معاشرتی استحصال کو کہانی کے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ محمد حفیظ کا ناول "کرک ناتھ" کمزور اور معصوم زندگیوں کا طاقت ور طبقے کے ہاتھوں تباہ ہونے کا نوحہ ہے۔

محمد حفیظ نے اپنے اس ناول میں سیاست اور اقتدار کی کشمش کے ساتھ عورت ذات کو بطور جنس موضوع بنایا ہے۔اس ناول کے نام "منتارا" کا مطلب ہے کہ ایک ایسا شخص جس کو تیر نا تو نہ آتا ہو مگر وہ خود بہت بڑا تیر ک کہتا ہو۔اس ناول میں ہمارے ملک کے سیاست دانوں کی اقتدار تک رسائی کی عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح ہمارے ملک میں حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں اور کس کس کو کس کے کہنے پر حکومت یا اپوزیشن میں بیٹھایا جاتا ہے۔اس طرح سیاست دان اپنی عیاشوں کے لیے عورت کو صرف ایک جنس سمجھ کر استعمال کرتے ہیں اور اسے اپنے مفادات کے لیے سیاسی طوائف بنادیتے ہیں۔یہ کہانی ایک عام منظر و پس منظر میں کو لمبوا ور پھوکٹ کے ساحلوں سے شروع ہوتی ہے اور پھر حسن و عشق کے معاملات سے ہوتی ہوئی آخر میں سیاسی اقتدار کی خاطر خون آلود واقعات پر ختم ہو جاتی ہے۔ مخدوم ناظر حیات اور نائلہ کے کردار مذکورہ صورت حال کے نمائندے ہیں۔ مخدوم ناظر حیات ایک روایتی سیاست دان ہوتا ہے اور اس کے شب و روز حسیناؤں کے ساتھ گزرتے ہیں۔اس کے ساتھ اس کا بیٹا ہادی حیات، بیگم سلمی وجاہت علی اور بیگم کشور النسا، منصور قریشی، چودھری کبیر حسین، فرمان اور صاحت کے کردار بھی موجود ہیں جو اس کہانی کی تار و پود میں اپنا وجود تسلیم کراتے نظر آتے ہیں۔

اس ناول کا م کردار مخدوم ناظر حیات ہے جس کا تعلق جاگردار طبقے کے علاوہ سیاست سے بھی جوڑا ہوا ہے۔ مخدوم ناظر حیات جنسی عیاشی کا اس قدر شوقین ہے کہ ہر وقت وہ حسیناؤں کی قربت میں رہتا ہے۔ مخدوم ناظر حیات کو سیاست بھی جاگیر کی طرح ورثے میں ملی ہوتی ہے۔وہ سیاست کے ذریعے عورت ذات کو استعمال کرتا ہے۔ مخدوم ناظر حیات کی دو شادیاں ہوتی ہیں یہ دونوں اس کی پسند کی نہیں بلکہ سماجی اور سیاسی مفادات کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ پہلی شادی جو کشور النسا سے ہوتی ہے وہ مخدوم ناظر حیات اپنے بھائی کے قاتلوں سے راضی نامے میں ان کی بہن سے کرتا ہے۔اور دوسری جو سلمی وجاہت سے ہوتی ہے وہ سیاسی مفاد کی غرض سے کرتا ہے۔خوبرو عورتوں سے تال میل اس کا مشغلہ ہوتا ہے، درجنوں خواتین سے خط اٹھاتے اٹھاتے جب اس کی نائلہ پر نگاہ پڑتی ہے تو وہ اسکا دیوانہ بن جاتا ہے اور اسے بستر پر لانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ نائلہ اس کے پاس آتی ہے مگر ایک سیاسی طوائف کی صورت میں کچھ عرصہ کے لیے اور پھر بعد میں مخدوم ناظر حیات کے قتل کی غرض سے اسکے پاس آتی ہے۔

مخدوم ناظر حیات حسیناؤں کے حصار میں رہنے کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے اور اپنے اس شوق کی تکمیل اور ہر قسم کے مفادات کی خاطر سیاست سے جڑے رہتا ہے۔ حسین عورتوں سے قربت کے کھیل میں ایک وقت ایسا بھی آجا تا ہے کہ مخدوم ناظر حیات مردانگی کا جوہر دکھانے کے لیے انجکشن لگاتا پھرتا ہے مگر اپنے اس شوق سے باز نہیں آتا ہے۔بقول ناول نگار:

"مخدوم ناظر حیات کی زندگی دو پٹڑیوں پر برابر بھاگتی چلی آ رہی تھی۔ یہ پٹڑیاں تھیں عورت اور سیاست۔ عورت اول اور سیاست ثانی۔ عورت لازم اور سیاست ثانوی۔ اس کی سیاست محض قومی اسمبلی کی ممبری کے طواف کا نام تھا کہ جس کے سبب اسے باکمال خواتین تک رسائی، سماجی طور پر رعب اور دبدبے کے علاوہ محفوظ و مامون مقام بھی حاصل رہتا۔ مخدوم ناظر حیات ملکی سیاست کے ان چند سدا بہار منتخب (electable) شخصیات میں سے تھا کہ جن کی ضرورت ہر سیاسی جماعت کو رہتی ہے۔ وہ اکثر آزاد امیدوار کے طور پر انتخابات کے میدان میں اترتا اور منتخب ہو کر اپنا لایا لگایا ایک طرف کرنے کے بعد اسی جماعت میں شامل ہو جاتا جو حکومت بنا رہی ہوتی۔"[41]

جب مخدوم ناظر حیات سر لنکا میں حسیناؤں کی طلب میں سر گرداں پھر رہا ہوتا ہے، تب اس کی دوسری بیوی سلمی وجاہت اور پہلی بیوی کا بیٹا ہادی حیات اسے اپنے راستے سے ہٹا کر سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ صباحت اور فرمان سے مدد لینے کے ساتھ ساتھ نائلہ کو بھی مخدوم ناظر حیات کے قتل کے لیے سر لنکا بھیج دیتے ہیں۔ سر لنکا میں نائلہ کو ایک غیر ملکی سریندر مخدوم ناظر حیات کے قتل پر بہت مجبور کرتا ہے مگر نائلہ جب ایسا کچھ نہیں کرتی تو وہ اسے اغوا کر کے کہیں لے جا رہا ہوتا ہے کہ اس کی گاڑی کا تعاقب کرتے ہوئے صباحت اور فرمان سڑک حادثے میں مر جاتے ہیں۔

مخدوم ناظر حیات سے اس کا بیٹا اس لیے ناراض ہوتا ہے کہ مخدوم ناظر نے اس کی ماں کشور النسا سے بے وفائی کرتا ہے اور بیگم سلمی وجاہت علی سے دوسری شادی کر لیتا ہے۔ اس لیے ہادی حیات اپنے باپ کا قتل کروانا چاہتا ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد وہ خود سیاسی لیڈر بن کر اقتدار حاصل کر لے گا۔ بیگم سلمی وجاہت علی سیاسی اقتدار کی خاطر اور اپنے والدین کے حریف سے بدلہ لینے کے لیے شوہر کا قتل کروانا چاہتی ہے۔ سلمی وجاہت سے مخدوم ناظر حیات نے جس حال میں شادی کی اس کی کہانی کچھ یوں ہے۔ سلمی وجاہت علی کے والد اور مخدوم ناظر حیات ایک دوسرے کے سیاسی مخالفین ہوتے ہیں۔ جب سلمی وجاہت علی کے والد وجاہت علی انتقال کر جاتے ہیں تو سلمی وجاہت علی اپنے حلقے میں سیاسی حیثیت حاصل کرنے کے لیے پریشان ہوتی ہے اور ادھر مخدوم ناظر حیات اپنی حیثیت کے لیے فکر مند ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں مخدوم ناظر حیات یہ حکمت عملی اپناتا ہے کہ سلمی وجاہت علی سے شادی کر اپنی سیاسی حیثیت بحال کر لیتا ہے۔ بیگم سلمی وجاہت علی کچھ عرصہ میں اس کی برائے نام مردانگی اور خوبرو عورتوں کی قربت کے نشے سے دل برداشتہ ہو کر علاحدگی اختیار کر لیتی ہے۔

جب مخدوم ناظر حیات منصور قریشی کے کہنے پر وطن واپس آتا ہے تو یہاں پر ایک نئی جال میں پھنس جاتا ہے۔اسے کہا جاتا ہے کہ بادشاہ لوگ اسے وزیر اعظم بنانا چاہتے ہیں۔اس لیے ان کے ہر حکیم منانا پڑے گا۔ مخدوم ناظر حیات کو یہ بات پسند نہیں آتی وہ خود کو گھر میں قید کر لیتا ہے۔اس دوران مخدوم کی منشا اور مرضی کے خلاف اس کی طرف سے حکومت کے خلاف ایک فارڈ بلاک بنایا جاتا ہے جس میں موجودہ وزیر اعظم سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔اس طرح کچھ دن بعد مخدوم ناظر حیات کو زخمی حالت میں کسی سڑک کنارے پھینک دیا جاتا ہے۔اسی طرح سے عوام اور اپوزیشن کی ہمدردیاں مخدوم ناظر حیات کو حاصل ہو جاتی ہیں۔اس صورت حال میں اپوزیشن لیڈر چودھری کبیر حسین فائدہ اٹھانے کی فکر میں مخدوم ناظر حیات کے بیٹے ہادی حیات کو اپنا ہمنوا بنالیتا ہے۔ مخدوم ناظر حیات آخر کار اپنے بیٹے کے ساتھ حکومت مخالف دھرنے میں دھماکے میں مارا جاتا ہے اور اسی صورت کا فائدہ اٹھا کر بیگم سلمی وجاہت وزیر اعظم بن جاتی ہے۔

اس ناول میں مخدوم ناظر حیات کے پس پردہ ناول نگار نے وطن عزیز میں موجود سیاست اور سیاست دان کی عکاسی کی ہے۔ مخدوم ناظر حیات کے کردار کے ذریعے حکومتیں بنانے والوں کی کارکردگی بھی پیش کی ہے کہ کس طرح ہمارے ملک میں لوگ وزیر اعظم بنتے ہیں اور کس طرح ان کو پھر ہٹایا جاتا ہے۔کیسے جھوٹی خبریں پھیلائی جاتی ہیں اور کس طرح صحافیوں اور عورت ذات کو استعمال کیا جاتا ہے۔کیسے ملک کے اندار خود کش دھماکے کرا کر عوام کو دہشت گردی کے نام پر مارا جاتا ہے۔ کس طرح بیوی کو اپنے شوہر اور بیٹے کو باپ کا دشمن بنادیا جاتا ہے۔ مخدوم ناظر حیات جیسے لوگوں کو یہ علم بھی نہیں ہوتا ہے کہ وہ کس طرح الیکشن میں کامیاب ہوئے ہیں اور کیوں ان کو وزیر اعظم بنایا جاتا ہے۔اس صورت حال میں مخدوم ناظر حیات بے خبری کی سولی پڑ لٹکتے لٹکتے "تنگ آمد بہ جنگ آمد" کے مصداق منصور قریشی اور نائلہ سے کہتا ہے۔

> "کیا وزیر اعظم ایسے بنتے ہیں کہ جیسے میں بنایا جارہا ہوں۔ میں تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ کون لوگ ہیں جو مجھے یہاں گھسیٹتے پھر رہے ہیں۔ میرے سامنے تو آپ دونوں کے چہرے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ پھر ہاتھ جوڑتا ہوں یہ اپریل فول بند کریں اور مجھے جانے دیں۔ چاہیں تو یہ فارم ہاؤس بھی میں آپ کو دان کرتا ہوں۔"[42]

اس کے جواب میں منصور قریشی کہتا ہے۔

> "مخدوم صاحب! آپ ریاست اور سیاست کو تو اچھی طرح سمجھتے ہیں ناں! ریاست ہو تو سیاست ہوتی ہے، ایک حکومت جاتی ہے تو دوسری آتی ہے۔ یہ کہیں نہیں ہوتا کہ اپنی

سیاست اور اقتدار بچانے کے لیے ریاست ہی قربان کر دی جائے۔ ریاست کا وجود مستقل اور سیاست چل چلاؤ۔ ریاست اپنے متقل اداروں سے استقامت پاتی ہے۔ انتظامیہ، عدلیہ اور فوج ریاست کی نگہبانی کرتے ہیں۔ انتظامیہ یا نوکر شاہی ریاست کے استحکام اور اس کے تحفظ کو یقینی بناتے ہوئے بدلتی ہوئی حکومتوں کے درمیان اقتدار کی منتقلی میں نہایت غیر جانبداری سے سہولت کاری کے فرائض سر انجام دیتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کیا ہوا؟ ہمارے ہاں تو اہلِ سیاست نے انتظامیہ جیسے ریاست کا وفادر ہونا چاہیے تھا، سیاستدانوں کی وفادار ہو کر ریاست کی جڑیں کھوکھلی کرنے لگی۔ ایسے میں جو خلا نوکر شاہی یا انتظامیہ پیدا کرتی ہے اسے پر کرنے کے واسطے دوسرے ادارے حرکت میں نہ آئیں تو کیا خاموشی سے ایک طرف بیٹھ کر ریاست ٹوٹنے کا نظارہ کرتے رہیں؟"[43]

منصور قریشی کے اس جواب نے ملک کی سیاسی، انتظامی اور دیگر اداروں کی کارکردگی کو سامنے رکھ دیا ہے۔ کس طرح ہمارے ملک میں مقتدر قوتیں خود کو قائم رکھنے اور ملک کے نظام کو چلانے کے لیے کیسے کیسے الجھاؤں میں گم ہیں، مخدوم ناظر حیات کو وزیر اعظم بنائے جانے کی کوششوں سے سب کچھ سامنے ہے۔ منصور قریشی جو صحافی کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ مخدوم ناظر حیات کو حکومت کی تشکیل کے بارے میں یہ بات بھی سمجھتا ہے کہ

"عالمی جنگوں کے ذریعے دنیا کے نقشے بدلنے کا زمانہ جا چکا اور وہ زمانہ بھی قصہ ماضی ہوا کہ جب باہمی یا پراکسی جنگوں سے ملکوں پر قابضے کیے جاتے تھے۔ ہمارا زمانہ اب ڈیپ سٹیٹ (DEEP STATE) تھیوی کی توسیع کا زمانہ ہے۔ ڈیپ سٹیٹ میں اپنے ہی ملک کی ایجنسیاں کوئی کاٹھ کا لگڑ بگڑ کرسی پر بٹھا کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتی تھیں لیکن اب تو دشمن ملکوں کی خفی ایجنسیوں کے ساتھ ساتھ دوست ممالک اور ان ظاہر و خفیہ ادارے اپنے ہی دوست ملکوں پر اپنی مرضی کی معاشی، سیاسی اور تجارتی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے حکومتیں بناتے اور توڑتے ہیں۔"[44]

اس ناول کا ایک اور اہم کردار نائلہ نامی ایک لڑکی ہے جو سیاسی طوائف کی نمائندگی کرتی ہے۔ نائلہ چند برس کی ہوتی ہے کہ اس کا والد دوسری شادی کر کے نائلہ اور اس کی ماں کو گھر سے بے دخل کر دیتا ہے۔ نائلہ اور اس کی ماں بے یار و مددگار ہونے کے سبب بھائی کے گھر (نائلہ کے ماموں کے گھر) آجاتے ہیں۔ نائلہ کی ماں اپنے بھائی کے گھر میں ایک کام والی کی حیثیت سے زندگی کے شب و روز گزار رہی ہوتی ہے۔ جب نائلہ کچھ بڑی ہوتی ہے تو ماموں کے ہاتھوں جنسی تشدد کا شکار ہو جاتی ہے۔ نائلہ کو ماموں کی درندگی کا سامنے کرنے کے بعد حالات سے سمجھوتہ کرتے کرتے یہ

احساس ہو گیا کہ انسانی زندگی میں رویے اور رسوخ کی کتنی اہمیت ہے۔اسی طرح کچھ مزید برس ماموں کی کفالت میں اس شعور کی پختگی کے حصول کے میں گزر دیتی ہے۔نائلہ نے ماموں کی شیطانیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر کا سارا نظام اپنے ہاتھ میں کر لیا اور پھر اپنی تعلیم بھی میٹرک تک مکمل کی۔اس دران نائلہ ان اسرار ورموز سے بھی آشنائی حاصل کرتی رہی کہ کس طرح ایک عورت مرد کو اپنے قابو میں رکھ سکتی ہے۔

"نائلہ نے سرنڈر کی آڑ میں جہاں گھر بھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے کر باقی سب کو ثانوی کر دیا وہیں ماموں کی حیوانیت کو بھی اس طرح نکیل ڈالی کہ اپنی مرضی کا مطیع کر لیا۔ اس کے سامنے اب ایک اور ٹارگٹ اپنی میٹرک تک تعلیم کا مکمل کرنا اور دوسرا اپنی چھوٹی بہن کو کسی نہ کسی طرح ماموں کی ہوس خیزی سے بچا کر رکھنا تھا۔سو ان معاملات میں کامیاب رہی۔وہ اس اٹکل سے آشنا ہو چکی تھی کہ جس کے ذریعے عورت، مرد جیسی مخلوق کو نکیل نہ ہوتے ہوئے بھی نکیل ڈالے رہتی ہے۔جس عمر میں لڑکیاں کاغذ کی کشتیوں سے کھیلتی ہیں، نائلہ اس عمر میں اپنے ماموں جیسے مردوں کی وحشیانہ جبلت اور جسمانی تو سیع پسندی کو اپنی حدود کے اندر رکھنے کی قدرت حاصل کر چکی تھی مردانگی کے حوالے سے اپنی اب تک کی زندگی میں نائلہ نے ویسے بھی اپنے باپ اور ماموں کو دیکھا اور بھگتا تھا۔اس لیے اگر اس کا کا زوایہ نگاہ صرف ان دو مردوں تک محدود تھا تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔دنیا کے تمام مرد اب اسے اگر اپنے ماموں یا باپ جیسے دکھائی دیتے تو اس میں ایسا غیر فطری کیا تھا۔"[45]

بچپن میں ماموں سے جنسی تشدد کا شکار ہونے والی نائلہ بڑی ہو کر سیاسی طوائف بن جاتی ہے اور اپنے کام میں اس قدر ماہر ہوتی ہے کہ اس کو ملکی و غیر ملکی ایجنسیاں ممبر شپ دے دیتی ہیں۔ایسی ایجنسیوں کی ممبر بن جاتی ہے جن کا کھیل دنیا بھر میں حکومتیں بنانا اور گرانا ہوتا ہے۔

"قبل از دوشیزگی اپنے پامال جسم سے بہنے والے لہو سے ہلکان لڑکی طاقت کا کھیل کھیلنے والے بکھیاڑوں کی قتل گاہوں سے ہوتی ہوئی، اقتدار کی غلام گردشوں سے سند یاب ہو کر سیاست و سیادت کی ان منزلوں تک آن پہنچی تھی کہ جہاں محسنوں کی جان لینا اور اپنی زندگی کو ہر دم داؤ پر لگائے رکھنا ہنر سے زیادہ بے وفائیوں کا مرہون منت سمجھا جاتا تھا۔ اس کی نم آلود بند آنکھوں کے سامنے کئی سر بریدہ لاشیں گزرتی چلی گئیں کہ جو اسے فریب دینے کی کوشش میں خود اس کے چلتروں کی تیغ تلے کہیں اپنی گردنوں اور کہیں

اپنی توقیر سے محروم ہوتی رہی تھیں۔اسے وفاؤں کے رنگوں سے بے وفائی کی ہولی کھیلنا آیا
تو مفادات کی لغت میں مہر و وفا کے معنی بدلتے چلے گئے۔"[46]

نائلہ نے جس ماحول اور جن حالات میں پرورش پائی تھی اسی کے اثر سے وہ ایک "سیاسی طوائف" بن کر سامنے آتی ہے۔اس لیے وہ ایوانِ اقتدار کی راہداریوں تک جا پہنچتی ہے اور حکومتیں بنانے، گرانے کے لیے بطور مہرے کے استعمال ہوتی رہتی ہے۔جس طرح مخدوم ناظر حیات اس سے اپنی ناکام آرزوؤں کی تکمیل کے لیے دھوکہ کھاتا رہتا ہے۔

یہاں نائلہ کے کردار کے ذریعے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ اقتدار کی جنگ میں انسانیت اور دیگر انسانی تعلقات کی بجائے صرف اور صرف مفاد کا حصول اہم ہوتا ہے۔اسی طرح عورت ذات کو انسان کی بجائے ایک جنس سمجھ کر کہاں کہاں استعمال کیا جاتا ہے۔نائلہ جیسے کردار ہمارے سماج میں کثرت سے موجود ہیں جن کو دیکھ کر ہمیں کھن تو آتی مگر ہم اس قدر اخلاقی طور پر گر چکے ہیں کہ ہم اپنی بچیوں سے جنسی تشدد کر کے سماج کی تباہی کا سبب بن رہیں۔اس صورت میں حیا پرور نہیں طوائفیں ہی پروان چڑھا کرتی ہیں چاہے وہ کسی انتقامی جذبے کی تسکین کے لے ہو یا پھر کسی انسانی ضرورت کی تکمیل کے لے ہو۔نائلہ کا کردار ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ معاشرے میں موجود جنسی بے راہ روی کا شکار عورتیں کس ماحول میں پیدا ہوتی ہیں اور کس طرح پروان چڑھتی ہیں اور کیونکہ غلط راہ اختیار کرتی ہیں۔نائلہ کے کردار سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہماری بچیوں کے حفاظت کے لیے کوئی رشتہ اب قابل اعتبار نہیں رہا ہے۔اس لیے اپنی بچیوں کو قریبی رشتوں سے دور رکھا جائے تاکہ کوئی نائلہ نہ بن سکے۔

ان ناولوں کے تجزیہ سے بات سامنے آتی ہے کہ محمد حفیظ سماج کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔سماج میں رائج خیر و شر کے پیمانوں کو سمجھتے ہیں اور پھر اپنا نکتہ ء نظر سامنے لانے کی بجائے اُن برائیوں اور خرابیوں کو نشان زد کرتے ہیں جو سماجی قدروں کی تباہی کا سبب بن رہی ہیں۔وہ کسی طرح کا تعصب ہو، ہوس ہو یا سماجی جبر ہو، محمد حفیظ ہر صورت کو جانتے ہیں اور اسے قاری کے سامنے آشکار کرتے چلے جاتے ہیں۔

محمد حفیظ کے ناولوں کا فنی جائزہ

ناول کا مختصر ارتقااور فنی عناصر:

ناول ادب کی ایک معروف صنف ہے۔ناول دراصل اطالوی (Italian) زبان کے لفظ ناولا(Novelle) سے مشتق ہے۔ جس کے معنی نیا یاانوکھا کے ہیں۔انگریزی کے توسط سے اردو ادب میں ناول کا آغاز ہوا۔رفیع الدین ہاشمی ناول کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> "ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے جو انگریزی کے توسط سے اردو میں رائج ہوا۔اس کے معنی ہیں انوکھا، نرالا اور عجیب اصطلاح میں ناول وہ قصہ یا کہانی ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہو اور ناول نگار کے مختلف پہلوؤں کا مکمل اور گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد ایک خاص سلیقے اور ترتیب کے ساتھ اپنے تجربات ومشاہدات کو کہانی کی شکل میں پیش کردے۔ناول میں حقیقت نگاری بنیادی چیز ہے فرضی، خیالی اور مافوق الفطرت باتوں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔دراصل ناول داستان کی ارتقائی شکل ہے۔"47

برصغیر پاک وہند میں جب داستان عروج پر تھی تو اس زمانے میں انگریزی ادب میں ناول کا چرچا تھا۔ جیسے برصغیر پاک وہند کے حالات بدلے تو اس کے ساتھ ہی اردو ادب کی فضا بھی تبدل ہوئی۔ نئی فکر، نئے رویے، رجحانات اور سوچوں نے ادب کے افق پر ناول کی صورت میں نئے ستارے کو جگہ دی۔ناول کا اردو ادب کے افق پر چمکنا برصغیر میں رونما ہونے والے سیاسی وسماجی تغیر کا مظہر ہے۔

اردو ناول کا باقاعدہ آغاز تو ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" سے ہوتا ہے مگر اس سے قبل مولوی عبدالکریم کا "خطِ تقدیر" منشی گمانی لعل کا "نقشِ دلرُبا" اور شیخ محمد غوث قریشی کا ناول "فسانہء غوث" منظر عام پر آچکے تھے لیکن ناقدین نے پہلا باقاعدہ ناول "مراۃ العروس" کو ہی قرار دیا ہے۔ جس زمانے میں حالی اور آزاد اپنی ملی جلی کوششوں سے جدید اردو شاعری کی داغ بیل ڈال رہے تھے تھیک اس وقت اردو ناول اپنے واضح خدوخال کے ساتھ ظاہر ہو رہا تھا۔ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر اب تک ہر قسم کے ناول معاشی، نفسیاتی، رومانی، تاریخی، مزاحیہ، جاسوسی، طربیہ، المیہ اور کرداری ناول وغیرہ لکھے گئے ہیں۔

> "ناول تمام ادبی اصناف میں وہ اہم صنف ہے جس کا کینوس رزمیہ شاعری اور ڈراما کے مقابلہ کہیں زیادہ وسیع ہے لہذا اس میں جدت خیال اور وسعت بیان کی بے پناہ صلاحیتیں

موجود ہیں۔ اس کے ذریعہ نہ صرف انسانی زندگی کی فطری ترجمانی اور انسانی کرداروں کی بہترین عکاسی ممکن ہے بلکہ طنز و مزاح، ظرافت اور قول محال کی مدد سے رزمیہ اور ڈرامائی انداز بیان کی بھی گنجائش ہے۔۔۔۔ناول عصری زندگی کی دستاویز ہونے کے علاوہ ذاتی زندگی کی تفسیر بھی ہے۔۔۔ناول وہ صنف ہے جس میں شاعری، ڈراما، تنقید، ریپوتاز، سوانح، سرگذشت جیسے اصناف ادب اور مصوری و موسیقی جیسے فنون لطیفہ سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔"[48]

ناول کے ابتدا کے متعلق محمد یٰسین لکھتے ہیں:

"دنیا کے تمام ادبی اصناف کے مقابلہ میں ناول غالباً سب کے اہم صنف ہے۔ کیوں کہ قصہ، کہانی، داستان یا رزمیہ اگرچہ انسانی تہذیب کے ابتدائی ادوار سے مقبول عام رہے ہیں لیکن بحیثیت منفرد صنف ادب کے ناول کی تاریخ بمشکل ڈھائی تین سو سال پرانی ہے۔"[49]

ناول میں انسانی زندگی کے تمام واقعات کی عمدہ عکاسی ملتی ہے۔ جب انسانی تہذیب اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہے تو انسانی واقعات کا تفصیلی اظہار ناول کے ذریعے ہوتا ہے۔ ناول انسانی زندگی کی مختلف کیفیات اور تجربات کا بہتر عکس ہوتا ہے۔ ایک بہترین ناول فکر و فن دونوں طرف اچھا ہوتا ہے اور اسے پڑھنے والا زندگی کے نئے پہلو سے آشنا ہوتا ہے۔ یعنی ناول کی کامیابی کا ضامن جمالیاتی اقدار کے ساتھ ساتھ ناول کا فکری پہلو بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات ناول میں ایک سے زیادہ قصے اور عہد کا بیان ملتا ہے۔ اکثر ناول نگار اپنے ناول میں تاریخ کے ساتھ سیاسی، سماجی تہذیبی اور معاشی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ناول کو جب ہم ایک فن قرار دیتے ہیں تو بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

"فن کی حیثیت سے ناول کی بھی تکنیک ہونی چاہیے۔"[50]

علی عباس حسینی "اردو ناول کی تنقیدی تاریخ" میں مختلف مغربی اربابِ علم کے قول نقل کرتے ہیں۔

"۱۔ اسٹونس کہتا ہے: "ناول نثر میں قصہ بیان کرنے کا فن ہے۔"

۲۔ گرانٹ سی نائٹ کا قول ہے: "ناول ایک حقیقت نگار نثری قصہ ہے۔"

۳۔ مسٹر مور کا خیال ہے: "ناول زمانہ موجودہ کی تاریخ ہے اور اس عہد کا کامل ترین تصویر جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

۴۔ برسٹلے کہتا ہے: "ناول زندگی کے لیے آئینے کے فرائض انجام دیتا ہے۔"[51]

ناول میں فنی تقاضوں کی خوبصورتی کو مد نظر رکھنا لازمی ہے لیکن ساری توجہ فنی تقاضوں کو نبھانے میں صرف نہیں کرنی چاہیے بلکہ خوبصورت فکر کو کمال فن سے نبھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ فنی لحاظ سے ناول کے عناصر ترکیبی میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری اور موضوع یعنی نظریہء حیات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ جب ناول نگار، ناول میں ان عناصر کو مہارت کے ساتھ برتتا ہے تو اس سے ناول کے فنی کمال کی عکاسی ہوتی ہے۔ ناول کے عناصر ترکیبی کی کیا اہمیت ہے اگر اس پر بات کریں تو قصہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ بہترین قصہ پڑھنے والے کے لیے دلچسپی سبب بنتا ہے۔ قصے کا خاکہ جو ناول نگار ترتیب دیتا ہے اسے پلاٹ کہتے ہیں۔ یعنی خام مواد کی ترتیب یا مختلف واقعات کے ربط و تعلق کو پلاٹ کہتے ہیں۔

> "پلاٹ کرداروں کے افعال و اعمال یا حرکات و سکنات کا محض مجموعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ واقعات کی منطقی تنظیم و ترتیب سے وجود میں آتا ہے۔"[52]

سید عابد علی عابد کہتے ہیں:

> "مربوط واقعات کا وہ سلسلہ جو کسی داستان یا ناول میں پایا جاتا ہے پلاٹ ہے۔"[53]

پلاٹ میں واقعات ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہوتے ہیں اور ایک مکمل اکائی کی صورت اختیار کیے ہوتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی:

> "ناول کا تعلق واقعات سے ہوتا ہے اس میں ان واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے جو کرداروں کو پیش آتے ہیں اس کو پلاٹ کہتے ہیں۔"[54]

ناول نگار قاری کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے اپنے ذہن میں دی گئی ترتیب کے مطابق تمام عناصر کو منظر عام پر لے کر آتا ہے۔

> "اسے جاننا چاہیے کہ وہ کیوں کر قصہ چھیڑے گا۔ قاری کی دلچسپی کس کس طرح بڑھائے گا اور اس دلچسپی میں مدوجزر کہاں کہاں پیدا کرے گا۔"[55]

مگر ڈاکٹر ابواللث صدیقی اس بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں

"جدید دور کے نفسیاتی ناولوں کا تو یہ عام رجحان ہے یہاں بھی پلاٹ اور واقعات کی ترتیب کی کوئی اہمیت نہیں وہ صرف اس ذہنی کیفیت کو سمجھنے میں مدد دینے کے لیے وضع کیے جاتے ہیں جن سے ناول نگار ہمیں متعارف کرنا چاہتا ہے۔"[56]

جدید ناول نگاروں نے پلاٹ کے بغیر بھی ناول لکھے ہیں مگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان ناولوں میں بھی داخلی سطح پر منظم پلاٹ کا شعور موجود رہتا ہے۔

پلاٹ کے ابتدائی حصے میں ناول نگار کرداروں کو روشناس کراتا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے معاملات کی گھتیاں پڑنی شروع ہو جاتی ہیں۔ تیسرے حصے میں معاملات الجھ جاتے ہیں اور یہ حصہ کہانی کے نقطۂ عروج کا ہوتا ہے۔ چوتھے حصے میں معاملات سلجھنے لگتے ہیں اور نتائج برآمد ہوتے ہیں یہ آخری حصہ ہوتا یہاں پر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

پلاٹ عام طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک سادہ جس میں ایک ہی کہانی سیدھے سادے انداز میں بیان کر دی جاے، دوسرا مرکب پلاٹ، جس میں مختلف کہانیاں مختلف واقعات کے ذریعے ایک خاص بنت میں مرتب کر دی جائیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

"مختلف واقعات میں ایک منطقی ترتیب وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے اور ہر آنے والا واقعہ گزرے ہوئے واقعات سے باہم مربوط ہو جاتا ہے۔ واقعات کا یہی ناگزیر پن دراصل پلاٹ کی تنظیم کا اصول اور داستان کے مقابلے میں ناول کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔"[57]

کوئی بھی قصہ یا کہانی کرداروں کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی ناول معاشرے کا عکس ہوتا ہے اس لیے اس میں ہر طرح کے کرداروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ناول میں کردار نگاری کی بہت زیادہ اہمیت ہے ناول میں جن افراد کا ذکر آتا ہے وہ اس کے کردار کہلاتے ہیں۔ بڑی حد تک کرداروں کی اصلیت پر ناول کی کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے۔ جس قدر کامیابی سے کردار زندگی کا اظہار کریں گے اتنے ہی کامیاب کہلائیں گے۔ کردار جتنے حقیقت سے قریب تر ہوں گے قاری کو اتنی ہی ان سے جذباتی وابستگی محسوس ہو گی اور وہ کرداروں کو اپنی زندگی میں چلتے پھرتے دیکھنے لگے گا۔ ڈاکٹر ابو اللث صدیقی کہتے ہیں:

"اعلیٰ درجہ کی کردار نگاری کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر کردار عام انسانی سرشت میں شامل ہوتے ہوئے بھی ان صفات اور خصوصیات کا امتیازی نشان یا ٹیپھ لیے ہوئے ہو ۔جنہیں ناول نگار اس کے ذریعے سے پیش کرنا چاہتا ہے۔"[58]

کردار نگاری کی اہمیت وافادیت کو ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اپنی کتاب "ناول کیا ہے" میں لکھتے ہیں:

"اب بھی وہ ناول ہلکا اور عامیانہ سمجھا جاتا ہے جس میں قصہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے بر خلاف اس کے وہ ناول جس میں قصے سے زیادہ دل چسپ کردار ہوں زیادہ بلند مانا جاتا ہے۔اس کا سبب یہی بتایا جاتا ہے کہ قصہ کے ساتھ زیادہ دلچسپی لینا ایک قسم کی طفلانہ دلچسپی ہے جس کا اثر جلد ختم ہو جاتا ہے لیکن کردار سے وہی شخص لطف حاصل کر سکتا ہے جو زیادہ ذی فہم ہو اور یہ لطف گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔"[59]

ناول کے کرداروں کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری کہتے ہیں:

"ناول کے کردار ایسی تصویر کی مانند دکھائی دیتے ہیں جس کے مختلف اجزاء کو مختلف مقامات سے یکجا اور اکٹھا کر کے پیش کر دیا جاتا ہے۔"[60]

کردار نگاری کی عام طور پر دو صورتیں ہوتی ہیں۔پہلی صورت یہ ہے کہ ناول نگار خود اشخاص، قصہ کے عقائد، جذبات و احساسات اور عام چال چلن پر روشنی ڈالتا ہے اور ان کی شخصیت کے بارے میں خود ہی کوئی اچھی یا بری رائے قائم کرتا ہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ ناول نگار خود سے کچھ نہیں کہتا بلکہ کہانی کے کرداروں کی آپس میں گفتگو، ان کے عادات واطوار، انداز فکر اور عقائد پر روشنی ڈالتا ہے۔

کردار نگاری کے بعد ناول کا اہم جزو مکالمہ نگاری ہے۔کردار کی زندگی سے روشناس ہونے کے لیے ہم واقعات سے مدد لیتے ہیں یا پھر مکالمے کی مدد سے۔ناول میں صرف واقعات بیان کرنے سے بوریت پیدا ہو جاتی ہے اس لیے ناول نگار مکالمے سے قاری کو کرداروں سے متعارف کرواتا ہے اور ان کی سرگرمیوں سے آشنا کرتا ہے۔یعنی مکالموں کے ذریعے ہم کرداروں کے خیالات، جذبات واحساسات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور مکالمہ اظہار خیال کا موثر ذریعہ ہے۔اس لیے لازمی ہے کہ مکالمہ فطری، مناسب، موزوں، واضح اور دلچسپ ہو اور اس میں عمر، طبقات جغرافیائی حالات اور رشتے کا خیال رکھا گیا ہو تاکہ ناول مجموعی طور پر حقیقی لگے۔

"مکالمہ کرداروں کی ذہنی کیفیات اور جذبات سے بھی میل کھاتا ہو اور غم اور خوشی کے موقعوں پر کرداروں کا لب ولہجہ بھی انسانوں کی طرح ہونا چاہئے۔"[61]

مکالمے میں جملے مختصر اور بر محل ہوں کیونکہ بے جا طوالت مکالموں کے فنی تاثر کو خراب کرتی ہے۔ ناول کی کہانی کے مطابق مکالمے ہونے چاہئیں۔ مکالمے روزمرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عکاس ہوں۔ مکالموں میں حفظ مراتب کا دھیان رکھنا لازمی ہے۔

"کوچوان کے رومانی معاشقوں سے گھٹیا قسم کی بیڑیوں کی بو آئے گی اور لچوں لفندروں کی عاشقانہ گفتگو میں چھچھورا پن کا رنگ جھلکے گا، شائستہ کردار مناسب، بر محل اور موزوں زبان استعمال کریں گے۔"62

ناول کی کہانی میں مکالمے کی وجہ سے تسلسل پیدا ہوتا ہے۔ ناول نگار زندگی کی اہم روایات، انسانی نفسیات اور فلسفہ حیات کی اقدار کو مکالموں کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ مکالمے ہی پلاٹ کو آگے بڑھانے میں معاون ہوتے ہیں اور کرداروں کی شخصیت پر سے نقاب اٹھاتے ہیں جس سے کرداروں کی نفسیات اور رجحانات واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اکثر ناول نگاروں نے واقعات کو بہتر انداز میں پیش کرنے کے لیے فطرت کی تصویریں بھی پیش کی ہیں۔ اسی لیے منظر نگاری ناول کے لیے بنیادی ضرورت کا درجہ رکھتی ہے۔ منظر نگاری جتنی پائیدار اور جامع ہو گی ناول کی کہانی اتنی جاندار ہو گی۔ ناول میں منظر نگاری کا مفہوم صرف فطرت کی تصویر کشی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ناول کے کرداروں کے اخلاق و عادات، ان کے عقائد اور نظریات، ان کے جذبات و احساسات، اور اس دور کے مخصوص معاشرتی ماحول کی عکاسی کو منظر نگاری سے جوڑے رکھتی ہیں۔ منظر نگاری سے ناول کے تاثرات سامنے آتے ہیں اور زبان و مکان کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ منظر نگاری کے آئینے میں ایک زمانہ، اس کی تہذیب اور اس کے فکری رجحانات دیکھے جا سکتے ہیں۔

"باکمال ناول نگار کا یہ فریضہ ہے وہ منظر نگاری کو اسی طرح باکمال بنائے اور کردار کے حرکات اور افعال رجحان و مزاج کو اس سے متاثر کر کے سلیقہ مندی کا ثبوت دے۔"63

بہترین منظر نگاری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک منظر کے ختم ہوتے ہی دوسرا منظر نظروں کے سامنے آجائے اور منظر کے بیان میں تسلسل اور فطری ربط ہو۔ مناظر کی پیش کش میں ڈرامائی کیفیت بھی موجود رہے تکہ مناظر متحرک، دلچسپ اور پر تجسس بن جائیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اچھے ناولوں میں فطرت کے مناظر کسی جذباتی واقعے کا چوکھٹا بنا کر پیش کیے جاتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کرداروں کے دلوں میں جو طوفان برپا ہوتے ہیں خارجی طوفان ان کی علامت بن جاتا ہے۔ بہار کی رنگارنگی اور دل آویزی ناول

کے کرداروں کے سکون قلب اور بہارستان سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے ہم کرداروں کو
مختلف زاویوں سے مختلف موسموں میں فطری مناسبت سے دیکھتے ہیں۔"64

ادھ ادھورے لوگ کا فنی جائزہ

کہانی/قصہ:

ناول کے لیے کہانی لازمی چیز ہے بغیر کہانی یا قصے کے ناول، ناول کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ محمد حفیظ نے اس ناول میں ریاست بہاول پور کا قصہ پیش کیا ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے ریاست بہاول پور کے حالات اور واقعات کو کہانی کی صورت میں فرضی کرداروں کے ذریعے حقیقی تاریخی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ محمد حفیظ ریاست بہاول پور کے پس منظر میں تقسیمِ برصغیر کی خوبصورت انداز میں عکاسی کرتے ہیں۔ کس طرح تقسیم کے نام پر صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کے دشمن بن گے اور معاشرہ بکھر کر رہ گیا۔ انسانی قدریں مفلوج ہو کر رہ گی تھیں۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے اور لاکھوں مارے گے تھے۔ اس افراتفری کے پیچھے ایک الجھی ہوئی سیاسی معاشرتی اور نظریاتی صورت حال تھی۔ اس کے علاوہ اس ناول میں ون یونٹ کا قصہ بھی شامل ہے۔ جب ریاست بہاول پور کے نواب صاحب ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق کرتے ہیں تو اس کے چند برس بعد ریاست ون یونٹ کی زد میں آجاتی ہے اور ریاست کی شناخت ختم ہو گئی۔ ریاست کی شناخت کی بحالی کے لیے ہر آدمی دربدر کی خاک چھاننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ محمد حفیظ نے اس ساری صورت حال کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔

پلاٹ:

ادھ ادھورے لوگ کا پلاٹ بہت مضبوط اور وسیع ہے۔ اس ناول کا پلاٹ صاف اور سیدھا ہے۔ یہ ناول کا اسلوب سادہ اور پر تاثر ہے۔ اس ناول میں معاشرے کے مختلف قسم کے مسائل کو بہاول پورے کے قصے کی شکل میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کی منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور زبان و بیان سب بہترین اس لیے ہیں کہ لکھنے والا اس خطے کی تہذیب و ثقافت سے خوب آگاہی رکھا ہے۔ محمد حفیظ کا تعلق بھی بہاول پور کے شہر احمد پور سے ہے۔ اس لیے اس نے بہاول پور کی تاریخ اور تہذیب کو بڑی عمدگی سے کہانی میں پیش کیا ہے۔

"انھوں نے نہ تو اپنے سماجی شعور کو بھاری بھر کم اصطلاحات کا لبادہ اڑھایا، نہ سیاسی شعور پر علامتی ملمع کاری کی، نہ نفسی اور جبلیاتی پہلوؤں کے اظہار میں غیر ضروری مبالغے سے کام لیا اور نہ زبان و اظہار میں تصنع برتا۔ بس سیدھے سبھاؤ کہانی سناتے چلے گئے، تصویریں

بناتے چلے گئے۔ جیسے ہلکورے لیتے پانیوں کی ندی پہاڑیوں، میدانوں اور سبزہ زاروں سے
اس طرح بہتی ہے کہ موسم، ماحول اور جغرافیے سے مناسبت رہے اور ساتھ ساتھ متجسس
ذہنوں اور حساس دلوں کو سیراب کرنا نہ بھولے۔"[65]

ایک ماہر تعمیرات جب کسی عمارت کی بنیاد رکھتا ہے تو اس پہلے فن تعمیر کے سارے تقاضوں کو پورا کرتا ہے بلکل محمد حفیظ نے بھی ادھ اھورے لوگ کے پلاٹ کی تصدیق کی ہے۔اس ناول کے تمام واقعات زنجیر کی کڑیوں کی شکل ایک دوسرے کے ساتھ اس چابک دستی سے جوڑا گیا ہے کہ کسی طرح کا خلا یا جھول نظر نہیں آتا۔

کردار نگاری:

ناول کے کرداروں کی بات کریں تو سب پہلے ہماری نظر مرکزی کردار فیاض پڑتی ہے۔اس کے بعد وادھو، نواب صاحب، حکیم رام لعل اور اس کی بیٹی تلسی وغیرہ اس ناول کے اہم کردار ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ضمنی کردار شامل کیا گیا ہے۔ ضمنی کردار ناول کی خوبصورتی پیدا کرتے ہیں اور ناول کو اپنی منزل کی طرف بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔فیاض کا کردار اس ناول کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے منزل تک لے جاتا ہے۔

فیاض:

فیاض ناول کا مرکزی کردار ہے باقی تمام کردار اس کے ارد گرد گھومتے ہیں۔فیاض واحد کردار ہے جو اول سے آخر تک کہانی میں موجود رہتا ہے۔فیاض کو اپنی شناخت کی بہت فکر ہوتی ہے اسی فکر کی خاطر وہ حکیم رام لعل کی شاگردگی اختیار کرتا ہے۔جب ایک دن فیاض حکیم کے ساتھ اس کے گھر جاتا ہے تو وہاں پر حکیم کی بیٹی کو دیکھ کر محبت کر بیٹھتا ہے مگر اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پاتا ہے کیونکہ اسکی وجہ فیاض کی شریف النفسی ہے۔ تلسی ہو یا مہرں یا بیگم سلمی بدرالدین، یہ کردار جس طرح جن حالات میں فیاض کے سامنے آتے ہیں اور ان سے فیاض جس طریقے سے اپنا دامن بچاتا ہے اس کے شریف النفسی کا ثبوت ہے۔فیاض کی نیک نیتی کو دیکھ کر حکیم رام لعل تقسیم کے وقت اپنا گھر اور دکان امانتا اس کے حوالے کر خود سرحد پار طرف سفر شروع کرتا ہے۔اس لیے فیاض اپنی جان سے بڑھ کر اس کی حفاظت کرتا ہے لیکن وہ اس حوالے آخر میں ناکام ہوتا ہے۔

ون یونٹ کی کہانی میں فیاض بہاول پور امقدمہ بڑی بہادری سے لڑتا ہے۔اس وقت میں جب ریاست بہاول پور اکا والی نواب صادق خان عباسی بے بس ہو کر دور دیس جا بیٹھتا ہے، اس وقت فیاض جیسے نوجوان اپنی جان کی پروا کیے بغیر ریاست کی شناخت کا مقدمہ سیاسی اور قانونی طور پر لڑتے ہیں۔فیاض کی طرح کئی فرض شناسوں اور وفاداروں

نے اپنی ریاست کی شناخت بحال کراتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی۔ فیاض ساری زندگی اپنی اور ریاست کی شناخت کے لیے لڑتا رہتا ہے اور ایک دن بے نام مارا جاتا ہے۔

واد ھو:

اس ناول کا ایسا کردار ہے جو متشدد ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ واد ھو کا تعلق مسلم مذہب سے ہوتا ہے اور اس کی ڈیرہ نواب کے بازار میں کریانہ کی دکان ہوتی ہے۔ دن میں جب اسے اپنے گاہکوں سے فرصت ملتی ہے تو وہ قریبی دھوبی " دھچر " کے پاس جا بیٹھتا ہے۔ واد ھو اور دھچر یا سیاست پر بات چیت کرتے ہیں یا پھر واد ھو کی اولاد نہ ہونے والے مسئلہ پر گفتگو ہوتی ہے۔ واد ھو خود بنجر ہوتا ہے مگر وہ اولاد نہ ہونے کا ذمہ دار اپنی بیوی کو سمجھتا ہے اور اس پر ہر وقت جسمانی تشدد کرتا رہتا ہے۔ واد ھو اپنے بنجر پن چھپانے لیے گھر والی کو قصور وار قرار کر ایک بھوپے کے پاس لیے جاتا ہے۔ واد ھو مذہبی تعصب میں بھی مبتلا ہوتا ہے وہ حکیم رام لعل سے اپنا اور گھر والوں کا علاج اس لیے نہیں کرواتا کہ حکیم کا مذہب ہندو ہے۔ واد ھو تقسیم برصغیر کے وقت حکیم رام لعل کی دکان پر قبضہ کرنے والوں میں سب سے آگے ہوتا ہے۔

نواب صادق خان عباسی:

اس ناول کا یہ اہم کردار ہے اس نے اپنے عہد کا ایک کامیاب حکمران ہوتا ہے۔ اس نے اپنے عہد میں ریاست بہاول پور میں خوشحالی اور امن و سکون کو قائم رکھا ہوا تھا۔ مگر نواب صادق خان عباسی نے ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق کر کے اور ریاست کو ون یونٹ کی دلدل میں چھوڑ کر خود بیرونِ ملک چلا جاتا ہے۔ اپنی ریاست سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لاتعلق ہو کر حکومت پاکستان سے وظیفہ لیتا رہتا ہے۔ جب فوت ہوتا ہے تو اس کی میت کو بہاول پور واپس لے آتے ہیں۔

حکیم رام لعل:

حکیم رام لعل کا تعلق ہندو مذہب سے ہوتا ہے۔ حکیم رام لعل اپنے کام میں ماہر ہونے کی وجہ سے پورے علاقے میں شہرت رکھتا ہے مگر اپنی گھر والی کو خوش نہیں رکھ پاتا ہے۔ اس کا مطب تو ڈیرہ نواب کے بازار میں ہوتا ہے اور گھر احمد پور میں۔ حکیم رام لعل سارا دن ڈیرہ نواب کے بازار میں بیٹھ کر کئی بیماروں کا دوادارو کرتا رہتا ہے اپنی بیوی بے نیاز ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی بیوی سوڈھی مل کے ساتھ تعلقات بنا لیتی ہے اور حکیم رام لعل کی غیر موجودگی میں سوڈھی مل اس کے گھر آتا جاتا ہے۔ تقسیم کے وقت حالات کی بگھڑتی ہوئی صورت حال کو دیکھ کر حکیم رام لعل اپنا گھر اور دکان فیاض کے حوالے کر کے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ہجرت کر جاتا ہے۔

تلسی:

تلسی حکیم رام لعل کی اکلوتی بیٹی ہوتی ہے جس کی عمر بیس اکیس برس ہے اور بہت خوب صورت ہے۔ تلسی پانچی جماعت تک تعلیم حاصل کرتی ہے تو اس کو گھر والے مزید تعلیم کی اجازت نہیں دیتے اور اسے گھر میں ہی بیٹھا دیتے ہیں۔ تلسی کا رشتہ اس کے اپنے خالہ ذات وشنو سے طے کیا جاتا ہے جو تلسی کو بلکل پسند نہیں ہوتا۔ وشنو ایک تو تلسی سے عمر میں کم ہوتا ہے اور دوسرا وہ دماغی طور پر بھی کمزور ہوتا ہے۔ تلسی فیاض کو پہلی نظر میں دل دے بیٹھتی ہے۔ تلسی کو فیاض سے اس قدر محبت ہو جاتی ہے کہ وہ ہر وقت فیاض کے انتظار میں ہوتی ہے۔ جب دروازے پر دستک ہوتی ہے تو وہ دوڑ کر جاتی ہے کہ کہیں فیاض نا ہو۔ وہ فیاض سے اظہارِ محبت کرنے کے لیے موقع تلاش میں ہوتی ہے کہ ایک دن اس کا باپ اور ماں کسی رشتے دار کی فوتگی پر جاتے ہیں تو حکیم رام لعل فیاض کو ایک رات گھر کی حفاظت کی ذمہ داری دے جاتا ہے۔ ان دنوں تلسی اور وشنو کی شادی کی تیاری جاری ہوتی ہیں۔ فیاض جب شام کو حکیم کے گھر پہنچتا ہے تو اس کا بستر گھر۔۔۔ میں لگا ہوتا ہے۔ تلسی اسی شب موقع پا کر فیاض سے اظہار کرتی ہے مگر فیاض اس کا دل توڑ دیتا ہے۔ اس اثنا میں تقسیم کی وجہ سے حالات خراب ہو جاتے ہیں اور تلسی اپنے ماں باپ کے ساتھ ہجرت کر جاتی ہے۔

ادھ ادھورے لوگ کی کردار نگاری کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار محمد حفیظ نے فنی اعتبار سے کردار نگاری کے تمام لوازمات کو بڑی عمدگی کے ساتھ برتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر کردار جاندار نظر آتا ہے۔ محمد حفیظ کی فکر کے ساتھ فن پر بھی دسترس کمال کی ہے۔

مکالمہ نگاری:

محمد حفیظ نے ناول میں بہترین انداز میں مکالمہ نگاری پیش کی ہے۔ آپ نے کرداروں کی آپس میں ہونے والی گفتگو میں زبان کا بہت خیال رکھا ہے۔ اس ناول میں سیاسی اور سماجی دونوں حوالوں سے مکالمے ملتے ہیں۔ محمد حفیظ نے مختصر اور طویل دونوں قسم کے مکالمے پیش کیے ہیں۔ سب پہلے وادھو اور دھچر کے درمیان سیاسی صورت حال پر مکالمہ ہے

"او یار۔۔۔ لگتا ہے کہ بکروال بادل پہنچا سو پہنچا۔"

"ساون ہے تو بکروال بھی آئے گا، کون سی انوکھی بات ہے"۔۔۔ دھچر نے وادھو کو جوابا آواز دیتے ہوئے مخصوص لہجے میں بلارا کیا۔ وادھو دکان کے تمام طاقچے جوڑنے کے بعد دھچر کے پاس آن بیٹھا جو امڈتے بادلوں کا موڈ بھانپ کر تیزی سے دکان کے سامنے استری والے پھٹے پر رکھے ہوئے ان دھلے کپڑوں کے انبار کو اندر کی جانب دھکیل رہا تھا۔

"بات صرف بکروال بادلوں کی نہیں، یہ تو آئیں گے اور دو چار بوندیں پانی کی گرا کر ادھر ادھر ہو جائیں گے، اصل بات تو اس روے کی ہے کہ یہ ریاست کہاں جائے گی۔ نئے ملک پاکستان کے ساتھ الحاق کرے گی یا یونہی ہندوستان میں شامل رہے گی۔" دھچر کے لہجے میں اب چڑا چڑا پن آ چکا تھا۔

"یار! تیرا میرا کیا واسطہ اس گڑ دھال سے، بہاول پور پاکستان میں رہے یا ہندوستان میں، میں نے یونہی لونی تیلی کرنی ہے اور تو نے لوگوں کی میل دھوتے رہنا ہے۔ یہ رولا اگر کسی کے واسطے ہے تو اس بہن بہنوئی حکیم رام لعل کے لیے۔ یہ جو چار چوباروں والی اونچی ماڑی نبا کر بیٹھا ہوا ہے ناں، سب کچھ یہیں چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا اسے"۔ وادھو نے سڑک کے اس پار حکیم رام لعل کی دوکان کی طرف دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر اونچی آواز میں بھڑاس نکالی کہ جو ابھی تک مریضوں سے بھری ہوئی تھی۔

دھچر نے بوکھلا کر ہولے ہولے کھنگارنے کی کوشش کی۔۔۔ "ہولے بول یار، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا، ابھی پاکستان کہاں سے بننے لگا۔ بھلا آدمی ہے بے چارہ حکیم، گھر چاہے احمد پور میں ہے مگر خدمت پورے ڈیرے کی کرتا ہے، ہر وقت حاضر، نہ کوئی لوبھ نہ کوئی لالچ۔ ہاتھ میں شفا کا تو کیا کہنا، اخیر ہے۔"

"لیکن ہے تو کراڑ ناں۔۔۔ شفا کو کسی نے گھول کے پینا ہے کیا۔" وادھو نے چڑ کر سر کو جھٹکا دیا مگر فوراً ہی لہجہ بدل کر ہولے ہولے مِنمِنایا۔۔۔"[66]

اس طرح دھچر اور وادھو کے درمیان گھریلو حالات پر بھی مکالمے ہیں۔

"اب پہنچ گئے گھر"۔۔۔ دھچر نے کڑھتے ہوئے خود پر طعنہ زنی کے سے انداز میں کلام کیا اور بھیگنے سے بچ رہنے کے لیے دوکان کے اگلے چھپر کی اوٹ میں ہو گیا۔ "یار بس خوا مخواہ کی باتوں میں مجھے لگا لیا۔۔۔ نکی کو بخار تھا اور بھابھی تمہاری گالیاں دے رہی ہو گی مجھے۔"

"یہ عورتوں کا کیا ہے، انہوں نے کبھی خوش نہیں ہونا ہوتا چاہے باندروں کی طرح الٹے بھی لٹک جاؤ۔۔۔ اس لیے بھائی میرے حوصلہ رکھو اور من موجی کیا کرو۔۔۔" وادھو برستی بوندوں کی بوچھاڑ تلے ہاتھ پھیلا کر چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

"او وادھو یارا۔۔۔ عورتوں کے بغیر گھر، گھر نہیں رہتے، رل جاتے ہیں۔" دھچر کے چہرے کی پریشانی کھمن کے لشکار کی طرح بار بار نمایاں اور کم نمایاں ہو رہی تھی۔

وادھو نے سرد آہ کھینچی اور پاؤن کے بھار بیٹھ گیا۔۔۔ "میری عورت بھی تیری عورت کی طرح منہ متھے والی ہوتی، پتر جن کے بیٹھی ہوتی تو میں بھی اس سے ملنے کی آس میں ٹھنڈی آہیں بھرا کرتا۔"[67]

وادھو کی جب اولاد نہیں ہو رہی ہوتی تو دھچر اس کو حکیم رام لعل سے علاج کروانے کا مشورہ دیتا ہے تو وادھو کا مذہب اس وقت آڑے آتا ہے۔ وہ مکالمہ کی شکل میں ہے۔

"یار کئی بار تجھے کہا ہے کہ حکیم رام لعل کو تو دکھاؤ، کئی بے اولادوں کی اولاد ہو گئی ہے، پر تو نے تو جیسے قسم اٹھائی ہوئی ہے نہ دکھانے کی۔" دھچر موقع دیکھ کر پھر سے شروع ہو گیا۔

"میں او ترک تو مر جاؤں گا مگر اس کراڑ کو ہاتھ نہیں دکھاؤں گا"۔ وادھو تپ کر کھڑا ہو گیا۔

دھچر ہنس دیا اور وادھو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے بولا "یار نہ تو دوادارو کا کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ ہی کسی حکیم کا۔ دوا، دوا ہوتی ہے اور حکیم، حکیم"

"اپنی حجتیں اپنے پاس رکھو۔ ہر چیز کا مذہب ہوتا ہے، دوا کا بھی حکیم کا بھی۔ حلال حرام کا فرق ہوتا ہے، جاؤ کوئی اور گھر دیکھو، میرے ایمان کی جڑ مت اکھیڑو۔" وادھو نے غصے میں ستلی والی خالی بوری کی تھیلی سی بنا کر سر پے رکھی اور تیز ہوتی ہوئی بارش کی پرواہ کئے بغیر بھیگتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔"[68]

فیاض اور اس کے باپ نذیر حسین کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے۔ اس مکالمے میں نذیر حسین کا مذہبی تعصب نظر آتا ہے۔ جب فیاض اپنے والد سے کہتا ہے کہ اس کو حکیم رام لعل سے حکمت سیکھنی ہے۔

"بابا سئیں! اگر وہ کراڑ دوادارو کر سکتا ہے تو اس سے حکمت سیکھنے میں مجھے کس بات کا لحاظ یا کس بات کی شرم۔" فیاض کی آواز میں بھلے اترے بخار کی نقاہت تھی لیکن اس کی آواز میں پنہاں عزم سے صاف لگ رہا تھا کہ جو وہ طے کر چکا ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹنے والا۔

"مگر بیٹا حکیم رام لعل صرف کراڑ ہی نہیں، سخت گیر اور خبطی بھی ہے۔ وہ تمہیں کیونکر شاگرد بنائے گا۔ نذیر حسین نے ایک بار پھر راستہ روکنے کی اپنی سی کوشش کی۔

"چھوڑیں۔۔۔ نہ کہیں آپ۔۔۔ میں خود ہی بات کر لیتا ہوں حکیم صاحب سے"۔ اتنا کہہ کر فیاض حسین اٹھ کھڑا ہوا مگر نذیر حسین حیرت زدہ سا سوچتا ہی رہ گیا کہ آخر لڑکے کو ہو کیا گیا ہے۔ بیٹے کو ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر اس نے فیاض کو آواز دی "ٹھہر او پتر ٹھہر۔۔۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ، تو کرا کے چھوڑے گا مجھ سے ترلے اس کراڑ حکیم کے۔ 69"

تلسی اور اس ماں کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے جب فیاض سامان دینے پہنچتا ہے تو

"اماں! فیاض ہے؟۔۔۔ تلسی نے پھر بھی پوچھ ہی لیا

"اور کون۔۔۔ وہی ہے مویا مسلا۔۔۔ ہزار بار کہا ہے تمہارے باپ کو کہ اس کے ہاتھ گھر کوئی شے نہ بھیجا کرو مگر وہ پھر بھی اسی کو بھیج دیتا ہے۔۔۔ بڑا حکیم بنا پھرتا ہے، پاکی پلیطی کی سدھ ہی نہیں"۔ تلسی کی ماں تھیلا اٹھائے بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

"اماں ہولے بول۔۔۔ وہ سن لے گا"۔۔۔ تلسی دانتوں کو جھپیڑ کر بولی۔

"تو سن لے، میری جان تو چھوٹے گی"۔۔۔ یہ کہہ کر رادھی نے تھیلے کو تخت پوش پر پھینکا اور خود سقاوے کے باہر رکھی پانی کی ولٹوئی میں سے پانی منگر میں نکال کر ہاتھوں پر بہانے بیٹھ گئی۔ 70"

فیاض اور اس کی ماں کے درمیان ایک چھوٹا سا مکالمہ بھی موجود ہے۔

"کہاں رہ گئے بیٹا آج۔۔۔ میری تو جان اٹکی ہوئی تھی"۔

"اماں اب یہ بادل اور برسات تو میرے بس سے باہر ہیں"۔ فیاض نے چوکی گھسیٹی اور چولہے کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا اور اماں چولہے پر توا رکھ کر پھلکا سینکنے لگی اور بھاجی والی کٹوری کو ادھ بجھے انگارے لال کرنے کے بعد ان کے اوپر دھر دیا۔

"اماں روٹی کھلانے لگی ہو تو میں ابا کو حقہ تازہ کر کے نہیں دے سکوں گا۔"

"نہ کرنا تم تازہ، میں پہلے کر کے دے بیٹھی ہوں۔"

"اچھا۔۔۔دیر سے آنے کا کچھ فائدہ تو ہوا۔۔۔"فیاض بے چینا ہو کر گرم ہوتی ہوئی روٹی بھاجی کو تاڑنے بیٹھ گیا کہ توے سے اب اتری سو کب اتری۔"[71]

وادھو کی ماں اور اس کی بیوی مہراں کا آپس میں مختصر سا مکالمہ تب پیش آتا ہے جب مہراں بھوپے کے پاس جانے کے لیے راضی ہو جاتی ہے۔

"اماں۔۔۔میں تیار ہوں تڈی بدلنے کے واسطے"

"مگر تمہارے تیار ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔تم میں اگر کچھ ہوتا تو لوگ تم سے یوں دور نہ بھاگتے۔"اس کی ساس اسے پکا کرنے کے لیے جان بوجھ کر طعنہ زنی پر اتر آئی تھی۔ مگر مہراں نے اس کی سنی ان سنی کر دی۔"تم نے ایک بار کسی جنوں والے پیر کا بولا تھا کہ جو بانجھ عورت کو بھی گبھن کر دیتا ہے۔"

"ہاہا کہا تھا میں نے۔۔۔پھر"

"مجھے فجریں لے چلو۔۔۔"

"تم جن کھیلو گی!۔۔۔"

"بس یوں سمجھ لو جن مجھے کھیلے گا۔۔۔لیکن اپنے بیٹے کو اچھی طرح بتا دینا۔۔۔اب مجھے طعنہ نہیں دے گا بانجھ عورت ہونے کا۔"[72]

مجموعی طور پر مکالمہ نگاری کی بات کریں تو ناول نگار محمد حفیظ نے زبان و بیان کا خیال رکھتے ہوئے موقع و محل کی مناسبت سے ہر کردار کی ذہنی سطح کے مطابق مکالمے پیش کیے ہیں۔

منظر نگاری:

اس ناول کی کامیابی کے پیچھے منظر نگاری کا بھی اہم حصہ ہے۔ محمد حفیظ نے جہاں باقی عناصر پر غور کیا وہاں اس نے ناول کی منظر نگاری پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ ناول کا آغاز ہی منظر نگاری سے ہوتا ہے۔ ناول پڑھتے وقت پورے بہاول پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ محمد حفیظ نے ناول میں نواب آف بہاول پور کے عمارت کی منظری نگاری اس طرح کی ہے۔

"ریلوے اسٹیشن اور اصلی ڈیرے کے درمیان پہلے احمد پور کا شہری علاقہ آتا ہے۔ پھر نواب صاحب کی فوجی چھاونی اور چھاونی کے بعد ڈیرہ نواب کی حد شروع ہوتی ہے جس

کے چھوٹے سے بازار کے بائیں جانب صادق گڑھ پیلس کی پر وقار عمارت ہے اور دائیں جانب ریاستی دفاتر کے بڑے صاحبوں کی حویلیاں اور بنگلے۔ جب کہ صادق گڑھ پیلس، نواب بہاول پور کا رہائشی محل ہے جس کے اطراف بیس بیس فٹ بلند فصیلوں کے سبب پینتیس فٹ اونچے مرکزی دروازے کے اندار سے دودھ کی مانند سفید عمارت ہرے بھرے سبز گھنے درختوں میں کہیں چھپی ہوئی اور کہیں ان میں سے بار بار جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مرکزی دروازے سے سفید عمارت تک تقریبا ایک فرلانگ طویل سڑک ہے جس کے دونوں جانب سرو کے اونچے اونچے درختوں کی قطاریں اور قطار میں برابر برابر فاصلے پر ہمہ وقت پہرے پر موجود نواب صاحب کے باوردی مستعد باڈی گارڈ۔"[73]

محمد حفیظ ہاں مناظر فطرت و قدرت کو بہت کم ملتے ہیں مگر جہاں کہیں نظر آتے ہیں تو کمال کے ہوتے ہیں۔ ناول ادھ ادھورے لوگ کی کہانی بہاولپور خطے کی ہے تو محمد حفیظ کا تعلق بھی بہاولپور سے ہی ہے۔ اس لیے بھی منظر نگاری عمدہ ہے۔

زبان و بیان:

ناول کی تشکیل و تعمیر میں ناول نگار کا اسلوب اور زبان بہت اہمیت رکھتی ہے۔ فنی لحاظ سے ناول نگار کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ناول نگار کس قسم کے الفاظ و تراکیب کا استعمال کرتا ہے۔ ادھ ادھورے لوگ زبان و بیان کے عتبار سے ایک خوب صورت دستاویز ہے۔ محمد حفیظ نے جس معاشرے کے لیے یہ ناول لکھا ہے اسی معاشرے کی تہذیب اور زبان کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ ناول نگار نے پہلے یہ ناول مکمل سرائیکی زبان میں تخلیق کیا اور پھر اسی کو اردو زبان میں بھی خود لکھا ہے۔ اردو میں بھی سرائیکی الفاظ کا استعمال اس چابکدستی سے کیا گیا ہے کہ ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں پڑتی۔

انواسی کا فنی جائزہ

کہانی/قصہ:

محمد حفیظ نے اس ناول میں دو مختلف قصے پیش کیے ہیں۔ یہ دونوں قصے بھی بہاول پور کے خطے کے عکاس ہیں۔ پہلا قصہ یہ ہے کہ جب انگریز سرکار ریلوے لائن کے ذریعے کراچی کو لاہور سے ملانے کی کوشش کر رہی ہوتی

ہے۔ جیسے ہی بہاول پور اور ملتان کے درمیان بہاتے ہوئے دریائے ستلج پر پل تعمیر کرنے اور وہاں سے ریلوے ٹریک بچھانے کی باری آتی ہے تو دریائے کے کنارے پر ایک چھوٹی سی بستی آدم واہن کا قدیم قبرستان راہ میں حائل ہو کر ان کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے۔ بستی آدم واہن کے لوگ اپنے قدیم قبرستان کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ تو انگریز سرکار ان لوگوں کی مزاحمت برداشت کرتی ہے مگر ایک دن، رات کو انگریز سرکار قبرستان کو مسمار کر دیتی ہے اور جو لوگ اس کی مزاحمت کرتے ہوئے سامنے آتے ہیں تو ان کو قتل کر دیتی ہے۔

اس ناول کا دوسرا قصہ ناول کے مرکزی کردار سنگری کا ہے جو اپنے فکر و احساس، حسن اور مزاج کی وجہ سے مشکلات میں ساری زندگی گزار دیتی ہے اور ایک دن سیلاب کے دوران ملبے میں دب کر مر جاتی ہے۔

پلاٹ:

انواسی کا پلاٹ بہت صاف اور سادہ ہے۔ ناول "انواسی" 1872 سے 1875 کے تین سالوں کے دوران میں بستی آدم واہن میں ہونے والے واقعات اور حالات کا آئینہ ہے۔ ناول نگار نے فنی حوالے سے ان سب چیزوں کا بہت خیال رکھا ہے جس کی وجہ یہ ناول ان کی فکر کے ساتھ ساتھ فنی لحاظ بہترین ہے۔ محمد حفیظ نے کہانی میں کرداروں، اور کرداروں کے درمیان مکالموں کو بہت اچھے سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ محمد حفیظ نے منظر نگاری پر بھی نہات توجہ سے کام کیا ہے۔

کردار نگاری:

محمد حفیظ نے کرداروں کی مدد سے ایک گم گشتہ تاریخی حقیقت کو اس ناول میں بے نقاب کیا ہے۔ ویسے تو یہ ناول بہت سارے کرداروں پر مشتمل ہے مگر اس ناول کے اہم کرداروں میں سنگری، سیدا، مولوی جار اللہ، منگر اور جان برنٹن وغیرہ ہیں جو اس ناول کی شہرت کا باعث بنے ہیں۔ باقی بہت سارے کردار اس ناول میں شامل ہیں مگر وہ کچھ وقت کے لیے سامنے آتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ جیسے مٹھل ماچھی جو ناول کے آغاز میں نظر آتا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔

سنگری:

سنگری ناول کا مرکزی کردار ہے۔ سنگری ایک خوبصورت اور بولڈ لڑکی ہوتی ہے جو اپنی ضد اور من مانی کی وجہ ہر وقت مشکلات کا سامنا کرتی رہتی ہے۔ اس کا تعلق اس طبقے سے ہوتا ہے جہاں بچوں کی نسبت پیدا ہوتے ہی طے کر دی جاتی ہے۔ سنگری کے پیدا ہوتے ہی اس کے ماں باپ نے اس کا سیدے نامی لڑکے سے نکاح کر دیا تھا۔ جب

سنگری جوان ہوتی ہے تو اپنے اس نسبت کی وجہ پریشان رہتی ہے کیونکہ سیدا بڑا ہو کر بستی کا بہادر جوان ہونے کے ساتھ ساتھ ضدی اور خود سر انسان بن جاتا ہے۔ سیدا سنگری کو اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور انا کے خول میں بند رکھتا ہے مگر سنگری کو اس طرح رہنا پسند نہیں ہوتا۔ سنگری چاہتی تھی کہ باقی لڑکیاں کی طرح اسے بھی بستی کے لڑکے چھیڑیں لیکن سیدے کے ڈر سے کوئی جوان سنگری کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ ایک دن، رات کے وقت سیدا سنگری کو گھر اٹھا کر دور کسی جگہ پر لیے جاتا اور وہاں پر سنگری کے ساتھ زبردستی جنسی تشدد کرتا ہے۔ اس رات انگریز بستی کا قبرستان مسمار کرنے کے لیے اپریشن کر رہے ہوتے ہیں سیدا سنگری کے ساتھ جنسی تشدد کے بعد اسے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ سنگری اپنی عزت کی خاطر بستی کے مولوی جار اللہ سے نکاح کر لیتی ہے۔ مولوی جار اللہ سے شادی کے چھ ماہ بعد سنگری کا بچہ پیدا ہوتا ہے اس بچے کا باپ سنگری کی نظر میں سیدا ہوتا ہے اس لیے وہ اس کا نام امانت رکھتی ہے۔ مولوی جار اللہ کی موت کے بعد سنگری پر مصیبتوں کے کئی پہاڑ ٹوٹتے ہیں۔ سنگری ان مصیبتوں کا مقابلہ کرتی کرتی ایک دن سیلاب کے دوران ملبے میں دب کر مر جاتی ہے۔

سیدا:

سیدا ناول کا ایک اہم کردار ہے۔ جب انگریز سرکار بستی کے قدیم قبرستان کو مسمار کرنے کا کہتی ہے تو سیدا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ قبرستان کے چاروطرف حفاظت کے لیے دن رات پہرا پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سیدا بستی کا سب سے بہادر جوان ہوتا ہے۔ سیدا سنگری کا منگیتر ہوتا ہے جب وہ قبرستان کے پہرے پر موجود ہوتا ہے تو اسے صرف سنگری کی فکر ہوتی ہے۔ سیدا سوچتا ہے کہ اگر انگریز سرکار کے ہاتھوں میری موت ہو گی تو سنگری کا کیا ہو گا۔ سنگری شادی سے پہلے بیاوا ہو جائے اور اپنی عدت پوری کر کے کسی دوسرے سے شادی کر لے گی۔ نہیں میں اس کو کسی اور کا نہیں ہونے دے سکتا۔ قبرستان کو اگر انگریز مسمار کرتے تو کر دیں میں اپنی سنگری کو کسی دوسرے کے حوالے نہیں کر وں گا۔ اس خیال میں ابھی ہوتا ہے کہ اس کے دل میں پھر اپنے اجداد کی محبت اور مذہبی تعصب اجاگ اٹھتا ہے اور کہتا ہے سنگری ہو جائے کسی اور کی میں قبرستان کو اپنے ہوتے مسمار نہیں ہونے دو گا۔ ایسا ہی ہوتا ہے ایک دن، رات کے وقت انگریز سرکار قبرستان مسمار کرتی اور اس کی راہ میں جو بھی مزاحمت کرتے ہوئے قتل ہو جاتا ہے یا پھر گرفتار۔ اس رات کے بعد سیدا کا کسی کو کوئی علم نہیں رہا کہ وہ مر گیا ہے یا ابھی تک انگریز سرکار کی قید میں ہے یا پھر خود کہیں چھپا ہوا ہے۔

مولوی جار اللہ:

ناول میں مولوی جار اللہ کا کردار دور رخے شخص کا ہے۔ مولوی جار اللہ کی بستی میں بہت عزت اور روب دبدبہ ہوتا ہے۔ جب بستی میں انگریز سرکار قبرستان اکھاڑنے کی بات کرتے ہیں تو مولوی جار اللہ اس کے خلاف فتویٰ جاری کرتا ہے کہ قبریں اکھاڑنا شریعت کے خلاف معاملہ ہے جسے بستی آدم واہن کے لوگ قبول کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف وہی مولوی انگریز سرکار سے مراعات لے کر اپنا فتوا واپس لیتا ہے اور قبرستان کے مردوں کو دوسری جگہ منتقل کرنی کا فتویٰ دے دیتا ہے۔ مولوی جار اللہ شہوت اور ہوس کا آدمی ہوتا ہے۔ کئی خواتین کو نکاح میں رکھنے کے باوجود "سنگری" کی خوبصورت دیکھ کر رال ٹپکانے لگتا ہے اور آخر کار اس سے بھی اپنی بیوی بنالیتا ہے۔ اس بات کو جانتے ہوئے بھی کہ سنگری کے پیٹ میں کسی اور کا بچہ ہے۔ محمد حفیظ نے مولوی جار اللہ کے کردار کے ذریعے مولوی طبقے میں موجود مفاد پرستی اور برائیوں کو بھی دکھایا ہے۔

جان برٹن:

جان برٹن جو ایک انگریز کردار ہے۔ جان برٹین باہمت اور مشکل وقت میں حوصلہ نہ ہارنے والا شخص ہے۔ یہ ریلوے کمپنی میں بطور انجینئر شامل ہوتا ہے۔ مشکل حالات میں اپنے اعصاب پر قابو پانے اور مصیبت سے ٹکرا جاتا ہے۔ جیسے جان برٹن جانتا ہے کہ اس کے خلاف سازشوں میں اس کا اپنا بیٹا بھی موجود ہے مگر پھر بھی وہ اپنے اوپر عائد کیے گئے جھوٹے الزامات کا سامنا بڑی بہادری کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان سب حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی نوکری نہیں بچا سکتا لیکن اپنے حق کے لیے لڑنے کا سبق ضرور چھوڑ جاتا ہے۔

منگر:

منگر بستی میں سیدے کی طرح طاقت ور اور بہادر ہوتا ہے مگر یہ ہر معاملے کو سوچ سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سیدے کی طرح جذباتی نہیں ہوتا ہے۔ منگر سنگری سے محبت کرتا ہے اس لیے سنگری کی حاطر بے گناہی کی سزا کاٹتا ہے مگر اس کی محبت دل نہیں نکال پاتا۔ سیدے کے لاپتہ ہونے کے بعد منگر سنگری سے شادی کرنی کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن سنگری اسے نہیں اپناتی۔ بستی میں جب سیلاب آتا ہے تو سنگری سمیت کئی لوگ مر جاتے ہیں مگر منگر سنگری کے بیٹے امانت کو زندہ بچالیتا ہے۔ جسے مولوی خاندان قبول نہیں کرتا اور اس کی پرورش پھر منگر خود کرتا ہے۔

مجموعی طور پر "انواسی" کے کرداروں پر بات کریں تو ہر کردار اپنی جگہ پر منفرد معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار محمد حفیظ نے بستی آدم واہن کی تاریخی کو جاندار کرداروں کی مدد پیش کیا ہے۔ انواسی میں محمد حفیظ نے کردار نگاری کی حد کر دی ہے۔

مکالمہ نگاری:

"انواسی" کے مکالمے برجستہ اور بے ساختہ ہیں۔ جن کرداروں کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے، وہ اس قدر جاندار ہوتا ہے کہ ان کرداروں کے احساسات اور جزبات کھل کر سامنے آتے ہیں۔ محمد حفیظ نے مکالموں کے ذریعے کرداروں کی نفسیاتی کیفیات، رجحانات و میلانات کی عکس بندی کی ہے۔ فنی حوالے سے محمد حفیظ کو یہ کمال حاصل ہے کہ اس نے "انواسی" کے مکالموں انسانی جذبات اور احساست کی بہترین مصوری کی ہے۔ جیسے ناول کے آغاز میں سیدے اور منگر کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے۔

"تمیں یاد ہے نا منگر میری ماں۔۔۔ جس کا تم نے بھی دودھ پیا ہوا ہے، کیا کہا کرتی تھی اپنے بارے میں؟" منگر نے بدستور الجھے ہوئے تاثرات کے ساتھ سیدے کو دیکھا مگر سیدا اسے مخاطب کرنے کے باوجود کہیں ماضی میں جھانک رہا تھا۔

"وہ کہا کرتی تھی نا کہ مرنے کے بعد مجھے اپنے باپ کے قدموں میں دفنانا!۔۔۔ اور ابھی دو سال پہلے وہ وہیں اپنے سئیں کے قدموں میں دفن ہوئی تھی۔۔۔ تو کیا کروں؟ ان کی میتیں نکال کر کہاں لے جاوں؟ کیا کوئی اپنی ماں کے ادھ گلے وجود کو دیکھ سکتا ہے؟ کیسے اکٹھے کرتا پھروں ان کے وجود کے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے محض اس لیے کہ گورا صاحب نے ان کی قبروں میں سے لوہے کے شہتیر گزارنے ہیں۔ کیسا حاکم ہے یہ کہ اپنی رعایا کو مرنے کے بعد بھی عزت آبرو کے ساتھ مٹی ہونے کا حق تک دینے کا روادار نہیں۔" سیدے کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔

"مجھے سب یاد ہے سیدے۔۔۔ مگر ہو کیا سکتا ہے؟ ہم گورا سرکار سے لڑ کر یا اخیر مر کر بھی اپنی بات نہیں منوا سکتے۔۔ سرکار نے جو کرنا ہے ہو کر رہے گا۔۔۔ ہمارے تمہارے وڈکوں کی ہڈیوں کو تو اب دھرتی بھی زیادہ دیر پناہ نہیں دے سکے گی۔ جو تم چاہتے ہو اس میں بس اتنا مختلف ہو گا کہ خون خرابہ ہو گا اور ہر چیز مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائے گی۔" منگر

افسردہ سامنڈھ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سیدا عقل کے استعمال کے سارے دروازے بند کرتا چلا جارہا تھا۔

"منگر ہو جانے دے مٹی کے ساتھ مٹی اور خون خرابہ بھی۔ کم از کم یہ تو ہو گا نا کہ ہم اپنی آنکھوں سے اپنے وڈکوں کی بھرتی ہوئی ہڈیاں اور گلا سڑا ماس تو نہیں دیکھ سکیں گے نا !۔۔۔اور سنو! میں آج قسم لینے جارہا ہوں بستی کے سارے نوجوانوں سے کہ آخر دم تک کوئی بھی گوروں کو بستی میں گھسنے نہیں دے گا۔۔۔اور ہاں۔۔۔اگر تم بھی ہمارا ساتھ دینا چاہو تو دیگر ویلے چڑھدے والی ڈھنڈ کے پاس قسم دینے آجانا۔"[74]

محمد حفیظ نے جو کرداروں کی گفتگو کرائی ہے۔ وہ اس قدر بھرپور ہے کہ جس سے ناول کے کرداروں کی شخصیت واضح ہو گئی ہے۔ کرداروں کا ظاہر اور باطن سامنے آگیا ہے۔ ان کے کرداروں کے مکالمے حقیقی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ سنگری اور اس کی ماں کے درمیان ایک مکالمہ ملاحظہ کریں۔

"کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہے؟ کس نے سکھائی ہیں یہ تمہیں یہ گندی باتیں؟ بھول جا ان کو، یاد رکھے گی تو ماری جائے گی۔ اور ہاں جیسا مرد تو چاہتی ہے نا! ایسے مرد صرف خوابوں میں ہوتے ہیں اور یہ جو ترلے والے ہر ویلے سجے کھبے غٹر غوں کرتے رہتے ہیں نا ! یہی ٹھیک ہوتے ہیں۔ عورت کو زندگی میں کبھی نہ کبھی ان ترلے والوں کی ضرورت ضرور پڑتی ہے مگر اس وقت یہ ترلے والے بھی نہیں ملتے صرف جوتے والے رہ جاتے ہیں قسمت میں۔۔۔جو چمڑی بھی ادھیڑتے ہیں اور ذلیل بھی رج کے کرتے ہیں۔"

""او میری ماں تو تو جانتی ہے کہ یہ باتیں ہمیں اور کوئی نہیں سکھاتا، پیدا ہوتے ہی ہمارا عورت ہونا ہمیں یہ سبق پڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اب تو مکرے تو اور بات ورنہ یہ باتیں تجھے بھی معلوم ہیں اور مجھے بھی معلوم ہوتی جارہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تو انہیں زبان سے نکالنا نہیں چاہتی اور مجھے وہ حرامی سیدا زبان سے نکالنا سکھا گیا ہے۔ وہ ویسا ہی مرد تھا جیسا میری طرح کی عورت کو چاہیے ہوتا ہے مگر اس دھی چود کو میری "ناں" کو سمجھنا ہی نہیں آیا، بجائے میری چمڑی ادھیڑنے کے، میرے اندر ہی تھوک کر چلا گیا اور وہ بھی زبردستی۔ ان بھڑوے مردوں کو پتا ہی نہیں کہ عورت ہے کیا اور کیا چاہتی ہے۔ یہ عورت کو اس کے چڈے چیر کر فتح کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ عورت کہتی ہے کہ میرا دل

چیر کر مجھے فتح کرو مگر یہ حرامی اپنی آکر خانی قائم رکھنے کے چکر میں نہ دیکھ پاتے ہیں اور نہ سن پاتے ہیں، بس ترلے کرتے ہیں، تلوے چاٹتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہ بن سکے تو جانوں مار دیتے ہیں۔"[75]

سیدے اور سنگری کا آپس میں مکالمہ ہے جب سیدا قبرستان کا پہرا دے رہا ہوتا ہے اور سنگری اس کے پاس جا کر پوچھتی ہے کہ تم نے مرنا ہی تھا تو پھر مجھ سے نکاح کیوں کیا تھا۔

"سنا ہے تو مرنا چاہتا ہے گوروں کے ہاتھوں۔" سنگری اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ سیدے نے اس کے لہجے کی کڑواہٹ محسوس تو کی مگر اس پر سنگری کے بدن کی خوشبو نے چڑھاوا چڑھا دیا۔ ایک لمبا سانس لیتے ہوئے سیدے نے سر اوپر کو اٹھا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کا سینہ سانس اندر روکنے سے اور بھی کشادہ ہو چکا تھا مگر دل کے آس پاس کھد بد مچائے ایک عجیب سی گدگدی نے اس کے ہونٹوں پر اس طرح تبسم بکھیرا کہ وہ سانس باہر نکالنا بھلا بیٹھا۔

"تو کیا چاہتی ہے؟"

"مر جا۔۔۔" سنگری ابھی تک پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف تکے جا رہی تھی۔

سیدے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا مگر منہ سے بولا کچھ نہیں۔

"تو نے مرنا ہی تھا تو مجھے حق میں کیوں لیا؟"

"میں نے کب لیا؟۔۔۔ نہ تو نے مجھے حق میں لیا اور نہ میں نے تمہیں۔۔۔ یہ تو ان سے پوچھ جنہوں نے حق حقوق کا یہ کھیل کھیلا۔" سیدے کی آنکھوں میں بے رحمانہ شرارت تھی۔ سنگری نے آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کر سیدے کی آنکھوں کی گہرائی کو ماپا اور پھر ایک دم واپس جانے کے لیے مڑی مگر سیدے نے لپک کر اس کے بائیں بازو کو کلائی سے گرفت میں لے لیا۔ خلافِ توقع نہ تو سنگری کسمسائی اور نہ ہی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ سیدے کو یوں لگا جیسے وہ چاہ رہی ہو کہ اسے روک لیا جائے۔

"ایسے نہیں جانے دوں گا"۔۔۔ سنگری کی پشت ابھی تک سیدے کی طرف تھی۔اس نے دایاں بازو پکڑ کر سنگری کا چہرہ اپنی طرف گھمالیا جس پر یہ سوال پہلے سے لکھا تھا کہ کیوں نہیں جانے دو گے؟

"۔۔۔وہ اس لیے کہ میں نے آج کا سچ دیکھنا ہے اور آج کا سچ یہ ہے کہ تو میرے حق میں ہے۔"

"تیرے حق میں ہوں تو مکلاتا کیوں نہیں؟ کیا کسی اور کے لیے رکھا ہوا ہے مجھے۔؟"[76]

مجموعی حوالے انواسی کے مکالمے بڑے چست اور کمال کے ہیں۔اس ناول کے مکالموں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ محمد حفیظ کی مکالموں کے اصولوں سے اچھی خاصی واقفیت ہے۔ کرداروں کے درمیان گفتگو کے وقت ان کی زبان، نفسیات اور تعلیم کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔

منظر نگاری:

انواسی میں محمد حفیظ نے منظر نگاری پر بہت خوب کام کیا ہے۔آپ نے کمال کی منظر نگاری کی ہے۔ناول میں جو ریلوے کمپنی کے عملے کے کیمپوں کی عکس بندی کرتا ہے۔

"دریائے ستلج کے آدم واہن پتن کے جنوبی کنارے پر شام ہوتے ہی انڈس ویلی ریلوے کمپنی کے عملے کے کیمپوں میں مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ روشن ہو چکے تھے۔ نباتاتی تیل یا حیوانی چربی سے جلنے والے چراغوں کی روشنی ان کے مقابل ادنی ہونے کے سبب مخص ٹمٹماتی یا تھر تھراتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ پیرافین یا کیروسین لیمپ کہلائے جانے والے یہ روشنی کے ہنڈے ریلوے کمپنی میں کام کرنے والے مقامی لوگوں کے لیے حیرت کا جہان تھے۔ان کے تئیں رات کو دن بنا دینے والے شیشے کے گھڑونچے جادوئی چراغ تھے جن سے وابستہ ہو چکی مفروضہ داستانیں اب اتنی بھی حیران کن نہیں رہی تھیں۔ پوہ کی سردیوں کے سبب صاحب بہادروں کے خیموں کے اطراف میں جنگلات سے کاٹی گئی لکڑیاں رات بھر جلائی جاتی رہتیں۔آگ کے تسلسل کو باقی رکھنے اور اس کی تپش پر ارد گرد سے اکٹھے ہو جانے والے جانوروں کو بھگانے کے واسطے پہرے داروں کی نگرانی کا لمحہ بھر کے لیے بھی موقوف کیا جانا کمپنی انتظامیہ کے نزدیک قابل

تعزیر فعل تھا۔ سو اس شام بھی سورج غروب ہوتے ہی خیموں کے اطراف میں آگ
جلانے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔"[77]

"انواسی" محمد حفیظ کا تاریخی ناول ہے جو ملتان اور بہاولپور کے درمیان بستی آدم وہن پر لکھا گیا ہے۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے پوری بستی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

زبان و بیان:

محمد حفیظ نے اس ناول میں سلیس اور سادہ زبان استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ سرائیکی زبان کے الفاظ کی لاگ سے خوبصورتی پیدا کی ہے۔ ناول نگار نے کمال کی بندشِ الفاظ، برجستہ جملے اور موقع محل کی مناسبت سے گفتگو سے اس ناول کو کامیابی کے ساتھ منزل تک پہنچایا ہے۔

کرک ناتھ

کہانی/قصہ:

محمد حفیظ نے اس ناول میں موجودہ عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے حالات و واقعات کو کہانی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ طاقت ور طبقے کی ٹکراؤ کی کہانی ہے۔ جس سے وابستہ کردار از خود وجود میں نہیں آتے بلکہ انھیں مفاد پرست اور ظالم طبقہ تخلیق کرتا اور اپنے استعمال کے بعد خود ہی ختم کر دیتا ہے۔ اس کہانی میں پاکستان کی اشرافیہ کے پاور پلے، جنسی تشدد، جیلوں میں قیدیوں سے امتیازی سلوک، پولیس گردی اور سوشل میڈیا پر خواتین کی عزتوں سے کھلواڑ سمیت کئی واقعات اس میں موجود ہیں۔ یہ ہمارے موجودہ سماج کا آئینہ ہے۔ یہ کہانی عمومی طور پر واقعات کے تسلسل کی مرہون منت ہے۔

پلاٹ:

"کرک ناتھ" کا پلاٹ سادہ ہونے کے سات ساتھ اس قدر چست ہے کہ قاری کو شروع سے آخر تک اپنے سحر میں رکھتا ہے۔ اس میں بظاہر تین قصے نظر آتے ہیں۔ ایک زفیرہ احمد کا، دوسرا ماہین کا اور تیسرا شاکا اور کاشی کا ہے جو پہلے الگ الگ سمتوں میں چلتے ہیں بالآخر یکجا ہو جاتے ہیں اور ناول ختم ہو جاتا ہے۔ محمد حفیظ نے کرداروں، مکالموں، منظر نگاری اور نہایت سیلس زبان کی مدد سے ایک بہتے ین ناول تخلیق کیا ہے۔

کردار نگاری:

محمد حفیظ کے ناول "کرک ناتھ" کے سارے واقعات بے شمار کرداروں پر مشتمل ہیں۔ جو کہانی میں جگہ جگہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ اس ناول کے اہم کرداروں میں زفیرہ احمد، ماہین، شبیر عرف شاکا جو بعد میں دانش سعید بنا کر سامنے آتا ہے اور کاشف عرف کاشی جو کبھی مبشر رضا، تو کبھی نیئر جمیل اور کبھی سردار محبوب کے نام سے سامنے آتا ہے۔ یہ ناول کے مرکزی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں باقی سب کردار ضمنی ہیں جو کچھ وقت کے لیے ظاہر ہوتے ہیں اور اس بعد ختم ہو جاتے ہیں۔

زفیرہ احمد:

زفیرہ احمد اس ناول کا ایک اہم کردار ہے جو ایک بڑے بزنس مین کی بیٹی ہوتی ہے۔ والد کی وفات کے بعد اکلوتی وارث ہونے کی وجہ سے باپ کی ایڈورٹائزنگ کمپنی کی چیف ایگزیکٹو بن جاتی ہے۔ ذہین و حسین ہونے کے باوجود شادی کی روایتی عمر سے نکل جانے کے بعد سنگل کامیاب وومن کی حیثیت سے زندگی گزارتی ہے۔ کاروباری سیاست، دولت کی ریل پیل اور سماجی طور پر اشرافیائی طبقے سے ہونے سبب بہت چالاک، ہوشیار اور خود سر ہوتی ہے، وہیں اس طبقے کے لوگوں کی طرح جانوروں سے جنسی لطف حاصل کرنے میں مبتلا ہوتی ہے۔ اپنی کمپنی کے کاروبار کے لیے فکر مندی کے سبب کاپی رائٹر (مبشر رضا) کی گم شدگی سے ہونے والے نقصان سے بچنے کے لیے اپنے سٹیٹس، اپنی عزت، دولت اور عفت و عصمت تک داؤ پر لگا دیتی ہے۔

> "جب وہ کاروباری عروج پر پہنچی تو رعونت اور بدلحاظی اس کے مزاج میں شامل ہوتی چلی گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انڈرورلڈ، شوبز اور ایڈورٹائزنگ ایک دوسرے سے لاتعلق ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں پنپ سکتے۔ زفیرہ احمد نے جھوٹ، وعدہ خلافی اور چترائی کو خطرناک حد تک اپنا وتیرہ بنالیا۔"[78]

ماہین:

ماہین ایک سادہ دل لڑکی ہوتی ہے۔ وہ ایم فل کیمسٹری کی سکالر ہوتی ہے۔ اس کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی یونیورسٹی میں کسی کے ساتھ دوستی نہیں ہوتی ہے۔ وہ یونیورسٹی کے بعد گھر میں اپنے کمرے میں بند رہتی ہے۔ وہ کمرے میں بند رہتے ہوئے انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا استعمال سے بعض ایسے لوگوں سے تعلق بنالیتی ہے جو اس کے ساتھ دنیا جہاں کے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے کرتے اسے جنسی معاملات کی طرف لے آتے ہیں اور اس کو خود لذتی کا مریض بنا دیتے ہیں۔ ماہین فیس بک پر پہلے جمال احسن نامی شخص سے دوستی کرتی ہے

۔جمال احسن ماہین اس مقام تک لیے جاتا ہے کہ ماہین سکائپ پر برہنہ ہونے کے لیے تیار ہو جاتی ہے مگر جمال احسن اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ جس کی وجہ سے ماہین جمال احسن کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی تلاش میں لگ جاتی ہے۔ آخر کار ایک دن اسکی نوید سے دوستی ہو جاتی ہے۔ نوید کے ساتھ وہ ٹیلی فون پر جنسی آسودگی حاصل کرتے کرتے وہ سکائپ پر بے لباسی کی منزلیں بھی سر کر جاتی ہے۔

ماہین اپنی مرضی سے بے لباسی کی بنائی ہوئی وڈیوز کی وجہ سے نوید کے ہاتھوں بلیک میل ہو جاتی ہے۔ جب نوید ماہین کو ہوٹل میں ملاقات کے لیے بلالتا ہے تو ماہین جیسے وہاں پہنچتی ہے تو نوید وصال سے قبل ہی زیادہ مقدار میں ویاگرہ لینے پر اسے ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ وہاں اس وقت ہوٹل کا ملازم طیفا اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ماہین کو بے آبرو کرنے بعد نوید کے قتل کے الزام میں گرفتار کرا دیتا ہے۔ ماہین گرفتاری کے بعد پولیس والے جنسی تشدد کا شکار بنی رہتی ہے۔ ماہین زندگی کے حادثات و صدمات کو برداشت کرتے ہوئے ایک دن زفیر احمد سے آملتی ہے اور ایک نیلاب کے نام سے ایک اشتہاری مہم کا حصہ بن کر سپر ماڈل بن جاتی ہے۔

شبیر اور کاشف:

شبیر اور کاشف اس ناول کے اہم کردار ہیں۔ شبیر کا تعلق غریب گھر سے ہوتا ہے۔ شبیر کا باپ مزدوری کی خاطر بیرون ملک چلا جاتا ہے اور پیچھے اس کی ماں اپنے ماموں زاد روشن سے جنسی تعلق بنا لیتی ہے۔ اس وقت شبیر کی عمر ساتھ آٹھ برس ہوتی ہے۔ وہ گھر میں رات کو ماں اور ماما روشن کے درمیان ہونے والی حرکات کو دیکھتا ہے تو دوسرے روز صبح کو نہاتے وقت اپنے جسم کا تقابل ماما روشن سے کرتا ہے مگر اس کو اپنا جسم ماما روشن جیسا نہیں لگتا۔ وہ سکول جاتے ہوئے کسی بھی مرد کو دیکھتا ہے تو خیالوں ہی خیالوں میں اس کے غیر ملبوس جسم کا تقابل ماما روشن کے غیر ملبوس جسم سے کرتا ہے۔ اس طرح وہ سکول میں مسٹر صاحب کے ہاتھوں پہلی بار جنسی تشدد کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ گھر سے بھاگ کر لاہور منڈا منڈی پہنچ جاتا ہے جہاں پر وہ شبیر سے شاکا بن جاتا ہے یہاں پر اس کی دوستی کاشف عرف کاشی سے ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں کچھ عرصے بعد منڈا منڈی سے بھاگ کر فاعل اور مفعول کا کھیل کھیتے، لوٹ مار کرتے تینتالیس آدمیوں کے قتل کے جرم میں جیل چلے جاتے ہیں۔ پھر جیل میں ان کی ملاقات رحمت خان سے ہوتی ہے۔ رحمت خان جس کا تعلق اشرافیہ سے ہوتا ہے اور وہ جیل میں موجود ہوتا ہے۔ اس کی اپنی اولاد نہیں ہوتی اس لیے شاکے اور کاشی کو تعلیم حاصل کرنے پر راغب کرتا ہے۔ جب شاکے اور کاشی کی سزا مکمل ہونے بعد جیل سے رہائی ہوتی ہے تو شبیر شاکے کی بجائے دانش سعید ولد رحمت خان ہوتا ہے اور کاشف کاشی کی بجائے کبھی مبشر رضا، کبھی سردار محبوب اور کبھی نیئر جمیل بن کر جرائم کی دنیا میں اپنی تسکین کا ساماں کرتا رہتا ہے۔

مکالمہ نگاری:

محمد حفیظ نے اس ناول کو پیش کرنے میں بیانیہ انداز اپنایا ہے مگر ساتھ ساتھ فنی مکالمہ نگاری کو بھی نبھایا ہے۔ محمد حفیظ نے مکالمہ نگاری کرتے وقت کرداروں کی ذہنی حیثیت و کیفیت کا بھی خیال رکھا ہے۔ ناول میں مکالمے کرداروں کی شخصیت کی محبت و نفرت کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ جیسے ایک جگہ پر ماہین اور اس کی ماں کا مکالمہ ہوتا ہے۔

"شام ڈھلے تو پرندے بھی اپنے بچوں کو گھونسلے سے باہر نہیں جانے دیتے لیکن میں کیسی ماں ہوں کہ جس کے پاس بیٹی کو ایک رات روک لینے کا بھی اختیار نہیں بلکہ صرف ایک گھنٹہ ہے تمھیں کسی نئی مصیبت سے بچانے کے لیے، اس کے بعد تمھارا باپ اور بھائی دونوں گھر پر ہوں گے۔"

ماہین کچھ بھی بولے بنا صرف ماں کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی۔

"تم منہ ہاتھ دھولو۔۔۔ میں کھانا لاتی ہوں۔۔۔ اور ہاں یہ رکھا ہے تمھارا سوٹ کیس جس میں تمھارے کپڑے اور کچھ رقم رکھی ہے جو تمھاری اس سال کی تعلیم کے لیے پس انداز کی تھی لیکن میں پریشان ہوں کہ تم اس وقت جاؤ گی کہاں؟ اگر کچھ دن کے لیے اپنے ماموں کے ہاں چھپ کر رہنا چاہو تو میں فون کر دیتی ہوں، امید ہے وہ مان رکھ لے گا۔۔۔ تم سیدھی وہیں چلی جاؤ۔"

"نہیں امی! جب اپنا گھر مجھے پناہ نہیں دے سکتا تو کسی اور سے کیا توقع رکھنا۔۔۔ ویسے بھی بہت جگہیں ہیں اس شہر میں چھپنے کے لیے۔۔۔ بس قیمت چکانی آنی چاہیے۔" جملے کے آخری لفظ ماہین نے کچھ اس انداز میں بولے کہ ماں لرز کر رہ گئی لیکن پھر بھی کچھ کہے بغیر کھانا لانے کے لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ماں کے کھانا لے کر آنے تک ماہین خود کو گھر چھوڑنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی۔ اس نے ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اوپر اٹھائے اور نہایت حوصلے سے، آنکھوں میں نمی لائے بغیر چوم لیے۔

"امی! کھانا نہیں کھا سکوں گی اب۔۔۔ چلتی ہوں۔۔۔ میں نے پانچ ہزار روپے نکال لیے ہیں لفافے میں سے، باقی تم کل میرے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا جو میں نے لفافے پر لکھ دیا ہے۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔"[79]

ناول میں ایک جگہ پر زفیرہ احمد اور شاید گوندل کے درمیان کاروباری مکالمہ بھی موجود ہے۔

"کیا ہے اس میں؟۔۔۔ زفیرہ احمد کا ذہنی تجس اس کی آنکھوں میں در آیا تھا۔

"آپ کی کمپنی کے فروخت شدہ انچاس فیصد شیئرز۔"

"مگر یہ آپ کے پاس کیسے آئے؟" زفیرہ احمد کے ہاتھ سے پیگ چھوٹنے لگا تھا۔

"خریدے ہیں۔"۔۔۔ گوندل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"لیکن آج اسٹاک مارکیٹ بند ہونے تک تو ان کا کوئی خریدار نہیں تھا؟"

"میڈم! یہ پاکستان ہے۔۔۔ یہاں کرامات ہوتی رہتی ہیں۔ آپ فائل کھولیے اور خود ہی دیکھئے کہ یہ تین لوگوں نے آج ہی خرے ہیں اور کل ان کا ریٹ اتنا زیادہ ہو چکا ہو گا کہ آپ کے دشمن دیوالیہ ہو کر بھی انھیں خرید نہیں پائیں گے۔ آپ انھیں اپنے پاس رکھئے اور کل صبح نئے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا اجلاس بلا کر کمپنی چلایئے پھر سے دبنگ انداز میں۔۔۔ اور ہاں بزنس کی فکر نہ کریں، بس چند دن اور۔۔۔ اور اس دوران سٹے خارج کرایئے عدالتوں سے۔"

"اس کے بدلے میں مجھے کیا قیمت چکانا ہو گی؟"

"مجھے نہیں معلوم لیکن جتنا میں جانتا ہوں۔۔۔ کچھ بھی نہیں!!"

"تو پھر مجھ پر یہ کروڑوں کی مہربانی کیوں؟"

"میڈم! میں نہیں جانتا اور نہ ہی میں نے خود سے کچھ کیا ہے۔۔۔ یہ ہمارے باس کا حکم تھا اور بس!! میں نے صرف حکم کی تعمیل کی ہے۔"

"باس؟ کون باس؟ اور مجھ پر کیوں یہ مہربانی؟"۔۔۔ زفیرہ احمد مسلسل حیرت کے جھٹکوں کی زد میں تھی۔

"آپ نہیں جانتی انھیں۔۔۔ وہ بھی آپ سے ملیں گے لیکن پہلے آپ اپنی کمپنی کو پھر سے چلالیں، ایسٹیبلش کر لیں تاکہ ملاقات اچھے ماحول میں ہو اور ہاں! بے فکر ہو جایئے اس بات کی گارنٹی کے ساتھ کہ اب مہ نور ایڈورٹائزرز کے شیئرز کا ریٹ نہیں گرنے والا کیوں کہ سو فیصد شیئرز آپ کے اپنے پاس ہیں۔" گوندل کھڑا ہوا تو زفیرہ احمد کو بھی کھڑا

ہونا پڑا لیکن وہ ابھی تک ابہام کے بھنور میں تھی کہ ایسا کیسے ہو گیا اور اگر ہوا بھی تو کس قیمت پر!!"[80]

منظر نگاری:

ناول نگار نے اس ناول میں بہت ہی کم منظر نگاری کی ہے۔ کیونکہ یہ ناول زیادہ تر کرداروں کی آپس میں گفتگو اور ان کے افعال اور اعمال پر مشتعمل ہے۔ منظری کم ہے مگر بڑے کمال کی ہے۔ مثلاً جب شاکا اور کاشی رحمت خان سے ملاقات کے لیے جاتے ہیں تو جس کمرے میں وہ انتظار کرتے ہیں اسکا منظر پیش کیا ہے۔

"انتظار گاہ کیا تھی ایک سجی سجائی فرشی نشست گاہ کہ جس میں ایک سے بڑھ کر ایک سامانِ آرائش، خشک میوہ جات کی لدی پھندی رکابیاں اور تمباکو نوشی کے لیے طویل مگر کھائے ہوئے مرصع پائپ کی ڈھیریاں جن کے ہونٹوں میں دبانے والے سرے ریشم کی سرخ تھیلیوں میں بند حقے کی دہکتی چلم کے نیچے اڑسے ہوئے۔"[81]

اس طرح جب ایدھی کی ایک ایمبولینس جو ٹریفک میں پھنسی ہوئی ہوتی ہے اس کا منظر بھی پیش کیا ہے۔

"فیض آباد دھرنے کے چھٹے روز ٹریفک کے اس اژدھام میں ایدھی سنٹر کی ایک سوزوکی ایمبولینس بھی شامل تھی جس کا نحیف سا سائرن اپنے آگے ٹھسی ہوئی گاڑیوں کے ڈرائیوروں میں راستہ دینے کی ہلکی سی جنبش پیدا کرنے میں مسلسل ناکام چلا آرہا تھا۔ پچکے ہوئے گالوں مگر اکہرے بدن کا پھرتیلا ڈرائیور بار بار عقبی شیشے میں ایمبولینس کے پچھلے حصے میں اسٹریچر پر بے سدھ پڑی لڑکی کی طرف دیکھتا اور ہر بار دیکھتے ہی سردی ہونے کے باوجود اس کے ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کے قطروں میں کچھ اور قطروں کا اضافہ ہو جاتا۔ تیئیس چوبیس برس کی اس لڑکی کے منہ سے بہنے والا جھاگ اس کی گردن سے ہوتا ہوا پانی کے قطروں میں منقلب ہو کر اسٹریچر سے نیچے گاڑی کے فرش پر گرنے لگا تھا۔ قدم قدم پر جام ہو چکی ٹریفک میں رینگ رینگ کر راستہ بناتے ہوئے ڈرائیو کو ہر گز یقین نہیں رہا تھا کہ وہ اسے زندہ اسلام آباد کے پمز ہسپتال تک پہنچا بھی پائے گا یا نہیں۔"[82]

زبان وبیان:

ناول نگار نے اس قدر سلیس اور سادہ زبان استعمال کی ہے کہ پڑھنے والا بوریت کا شکار نہیں ہوتا ہے۔ بیان کی بے ساختگی تشبیہات واستعارات اور علامتوں کی وجہ سے زندگی کی حقیقت ہی نہیں کھولتی بلکہ کرداروں کی نفسیات کی بھی سامنے آجاتی ہے۔ یہ ناول ایک کامیاب ناول ہے کیونکہ ناول کی کامیابی یہی ہوتی ہے کہ وہ زندگی کی جن سچائیوں کو پیش کرے ان کو قاری محسوس بھی کر سکے، ان کا ادراک کر سکے۔ کرک ناتھ میں بیان کی گئی سچائیاں ہمارے آس پاس موجود ہیں، بس ذرا غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

منتارا

کہانی/قصہ:

محمد حفیظ نے "منتارا" میں ملک کی سیاسی صورتحال اور اقتدار اعلیٰ کی کشمکش کو کہانی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے مخدوم ناظر حیات کے کردار کے ذریعے وطنِ عزیز کے تمام سیاسی لیڈروں کی عکاسی کی ہے کہ کس طرح ہمارے سیاسی لیڈر الیکشن میں کامیاب ہونے کے لیے یا اقتدار اعلیٰ کی کرسی کی خاطر جھوٹی خبروں سے عام عوام کو بے وقوف بناتے ہیں اور ملک میں عوام کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس سب کے علاوہ "سیاسی طوائف" کی برنڈنیو اصطلاح اپنی تمام تر معنوی برہنگی کے ساتھ موجودہ ہے۔

پلاٹ:

ناول کا پلاٹ بہت مختصر ہے۔ ناول میں ذخیرہءالفاظ کو بہت کمال ہنر سے برتا گیا ہے۔ اس ناول میں فرضی کرداروں کے ذریعے پاکستان کے سرداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کی زندگیوں کی ترجیحات اور سفاکانہ رویوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ جو اپنی ذات میں خود غرض ہونے کے ساتھ نااہل بھی ہیں۔ ان لیڈروں کی بد عنوانی اور نااہلی بیرونی طاقتوں پر آشکار ہے۔ محمد حفیظ اس ناول کو کرداروں کے علاوہ مکالمہ نگاری اور منظر نگاری سے کامیاب کوشش سے منزل تک لیا گیا ہے۔ یہ ناول زبان وبیان کے حوالے سے بھی شاندار ہے۔

کردار نگاری:

ناول کا مرکزی کردار تو مخدوم ناظر حیات ہے مگر اس کے ساتھ اس کا بیٹا ہادی حیات، بیگم کشور النسا اور بیگم سلمی وجاہت علی، منصور قریشی، صباحت، نائلہ، فرمان اور چودھری کبیر حسین کے کردار بھی موجود ہیں۔ اس ناول اہم کردار مخدوم ناظر حیات اور نائلہ ہیں جو اول سے آخر تک موجود رہتے ہیں۔

مخدوم ناظر حیات:

اس ناول کا مرکزی کردار مخدوم ناظر حیات ہے جس کا تعلق جاگردار طبقے کے علاوہ سیاست سے بھی جڑا ہوا ہے۔ مخدوم ناظر حیات جنسی عیاشی کا اس قدر شوقین ہے کہ ہر وقت وہ حسیناؤں کی قربت میں رہتا ہے۔ مخدوم ناظر حیات کو سیاست بھی جاگیر کی طرح ورثے میں ملی ہوتی ہے۔ وہ سیاست کے ذریعے عورت ذات کو استعمال کرتا ہے۔ مخدوم ناظر حیات کی دو شادیاں ہوتی ہیں یہ دونوں اس کی پسند کی نہیں بلکہ سماجی اور سیاسی مفادات کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ پہلی شادی جو کشور النسا سے ہوتی ہے وہ مخدوم ناظر حیات اپنے بھائی کے قتل سے راضی نامے میں ان کی بہن سے کرتا ہے۔ اور دوسری جو سلمی وجاہت سے ہوتی ہے وہ سیاسی مفاد کی غرض سے کرتا ہے۔ خوبرو عورتوں سے تال میل اس کا مشغلہ ہوتا ہے، درجنوں خواتین سے خط اٹھاتے اٹھاتے جب اس کی نائلہ پر نگاہ پڑتی ہے تو وہ اسکا دیوانہ بن جاتا ہے اور اسے بستر پر لانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ نائلہ اس کے پاس آتی ہے مگر ایک سیاسی ظوائف کی صورت میں کچھ عرصہ کے لیے اور پھر بعد میں مخدوم ناظر حیات کے قتل کی غرض سے اسکے پاس آتی ہے۔ آخر ایک دن کسی سازش کے تحت اپنے بیٹے سمیت دھماکے میں مارا جاتا ہے۔

نائلہ:

اس ناول کا ایک اور اہم کردار نائلہ نامی ایک لڑکی ہے جو سیاسی طوائف کی نمائندگی کرتی ہے۔ نائلہ چند برس کی ہوتی ہے کہ اس کا والد دوسری شادی کر کے نائلہ اور اس کی ماں کو گھر بے دخل کر دیتا ہے۔ نائلہ اور اس کی ماں بے یار و مددگار ہونے سبب بھائی کے گھر (نائلہ کے ماموں کے گھر) آجاتے ہیں۔ نائلہ کی ماں اپنے بھائی کے گھر میں ایک کام والی ماسی کی حیثیت سے زندگی کے شب و روز گزر رہی ہوتی ہے۔ جب نائلہ کچھ بڑی ہوتی ہے تو ماموں کے ہاتھوں جنسی تشدد کا شکار ہو جاتی ہے۔ نائلہ ماموں کی درندگی کے بعد حالات سے سمجھوتہ کرتے کرتے یہ احساس ہو گیا کہ انسانی زندگی میں روپے اور رسوخ کی کتنی اہمیت ہے۔ اسی طرح کچھ مزید برس ماموں کی کفالت میں اس شعور کی پختگی کے حصول کے میں گزر دیتی ہے۔ نائلہ نے ماموں کی شیطانیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر کا سارا انظام اپنے ہاتھ میں کر لیا اور پھر اپنی تعلیم بھی میٹرک تک مکمل کی۔ اس دران نائلہ ان اسرار و رموز سے بھی آشنائی حاصل کرتی رہی کہ کس طرح ایک عورت مرد کو اپنے قابو میں رکھ سکتی ہے۔ بچپن میں ماموں سے جنسی تشدد کا شکار ہونے والی نائلہ بڑی ہو کر سیاسی طوائف بن جاتی ہے اور اپنے کام میں اس قدر ماہر ہوتی ہے کہ اس کو ملکی و غیر ملکی ایجنسیاں ممبر شپ دے دیتی ہیں۔ ایسی ایجنسیوں کی ممبر بن جاتی ہے جن کھیل دنیا بھر میں حکومتیں بنانا اور گرانا ہوتا ہے۔

نائلہ نے جس ماحول اور جن حالات میں پرورش پائی تھی اسی کے اثر سے وہ ایک "سیاسی طوائف" بن کر سامنے آتی ہے۔ اس لیے وہ ایوانِ اقتدار کی راہداریوں تک جا پہنچتی ہے اور حکومتیں بنانے، گرانے کے لیے بطور مہرے کے استعمال ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح مخدوم ناظر حیات اس سے اپنی ناکام آرزوؤں کی تکمیل کے لیے دھوکہ کھاتا رہتا ہے۔

مکالمہ نگاری:

محمد حفیظ کے اس ناول میں زیادہ مکالمہ نگاری سے کام لیا ہے۔ کہیں پر مختصر اور کہیں پر طویل مکالمے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس ناول میں سیاسی مکالموں کے علاوہ رومانوی طرز کے مکالمے بھی کرداروں درمیان پیش آئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ پر منصور قریشی اور مخدوم کے درمیان ٹیلی فونک مکالمہ ہے

"اس بار معاملہ دو تین ماہ کا ہی ہے اور آپ کا نام اگلے سیٹ اپ میں اہم ترین پوزیشن کے لیے "زیر غور" سے بھی اوپر آچکا ہے۔"

"او چھوڑو منصور قریشی! اب اتنی بھی نہ ہانکو کہ میں سینیٹری سے بھی جاؤں۔۔۔ سدھی بات کرو کوئی مجھ سے کام ہے تو خوش خبریاں نہ سناؤ اپنے مطلب کی بات کرو۔" مخدوم کے لہجے میں چڑاچڑاپن تو تھا مگر تصنع اس سے بھی زیادہ نمایاں۔

"مخدوم صاحب! میں نے آپ سے کیا لینا؟ ہم تو آپ کے خیر خواہ ہیں، آپ کو بڑی کرسی پر دیکھنا چاہتے ہیں لیکن کم سن چھوکریوں پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں تو ہم کون ہوئے آپ کو بے سکوں کرنے والے۔"

مخدوم کو یوں محسوس ہوا کہ منصور قریشی شاید فون بند کرنے والا ہے لہذا اس نے بھی صورتِ حال کو پھر سے اس خوشگوار سطح پر لانے کے لیے ایک بلند قہقہہ لگا دیا۔ "یار قریشی! مجھے یقین ہے کہ تم دوست ہو۔ کیا یہی کم ہے کہ تم نہ خود میرا فون ریکارڈ کرتے ہو اور نہ کسی اور کو کرنے دیتے ہو لیکن پھر بھی احتیاط لازم۔"

"مخدوم صاحب! میں نے ایسی کون سی بات کر دی؟"

"یہی ناں چھوکری والی!۔۔۔"

"تو آپ بھی احتیاط کریں ناں۔۔۔ یہ گیلی فاس کو لمبو میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟"

"وہی کر رہے ہیں جو ایک بوڑھا آدمی کرتا ہے۔۔۔ ساحل پر بیٹھ کر مچھیاں دیکھنا اور لہریں گننا۔۔۔ اور کیا؟"

"آپ کہاں بوڑھے مخدوم صاحب! ابھی تو آپ نے وزارت عظمیٰ پھڑکانی ہے۔"[83]

نائلہ اور ایک اجنبی کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے جس میں مخدوم ناظر حیات کے قتل کی سازش سامنے آتی ہے۔

"مجھے تمہارا جواب جاننا ہے کتیا؟"

"میرے بال چھوڑو باسٹرڈ!۔۔۔ یہ کیا طریقہ ہے کسی عورت سے بات کرنے کا۔"

نائلہ کے لہجے میں کچھ ایسی حاکمانہ رعونت تھی کہ اجنبی نے اس کے بال چھوڑ دیے۔

"جی۔۔۔ میری بات کا جواب؟"۔۔۔ اجنبی کا لہجہ بدستور کھردرا تھا۔

"پہلے اپنی شکل دکھاؤ۔" نائلہ اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بظاہر لاپروائی سے بولی لیکن اس کے باوجود اس نے چہرے پر چڑھا ہوا نقاب اوپر کو اٹھا دیا۔

"ہوں۔۔۔ تو واقعی تم ہو۔۔۔ فرض کرو کہ میں تمہارے آقاؤں کی بات مان لیتی ہوں تو مجھے کیا ملے گا؟ ہونہہ!!" خباثت اجنبی کے چہرے سے اتر کر اب نائلہ کے رویے میں در آئی تھی۔

"میں بتا چکا ہوں۔۔۔ اور سریندر کبھی اپنی بات نہیں کرتا۔" نقاب اس نے پھر سے اپنے چہرے پر چڑھا لیا تھا۔

"تم نے جو بتایا وہ تو مالی مفاد ہے۔۔۔ میری جان کی حفاظت کون کرے گا؟"

"جان کی حفاظت تم خود کرو گی! تم شاطر ہو، مکار ہو، حسین ہو اور سب سے بڑی بات کہ حسن کو بطور ہتھیار استعمال کرنا جانتی ہو۔۔۔ تمہارے جان کون لے گا؟"

"نائلہ مسکرا کر اس کے قریب چلی آئی اور اجنبی کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیں۔

"اور اگر میں مخدوم کی جان نہ لے سکی تو۔۔۔؟"

"تو تمہاری جان میں لے لوں گا اس لیے کہ مجھے حسین عورتوں سے نفرت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے نائلہ کے ہاتھ اپنے کندھوں سے جھٹک دے۔ نائلہ کی آنکھوں کا رنگ ایک لمحے کے لیے متغیر ہوا لیکن اگلے ہی لمحے پھر سے مسکرا دی۔

"میں تیار ہوں لیکن اگلی حکومت میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر ایک قومی اسمبلی کی نشست اور اسی کی بنیاد پر وفاقی وزارت میرے لیے ابھی سے مختص ہو جانی چاہیے۔" نائلہ کی آنکھوں میں چمک کی بجائے عجیب رنگ کی بے رحمی چھلکنے لگی تھی۔"[84]

منظری نگاری:

ناول کا آغاز ہی منظر نگاری ہوتا ہے۔ ناول نگار کو لمبوا ور پھوکٹ کے حسین ساحلوں کے ساتھ وہاں پر موجود قدیم طرز پر تعمیر ہوئے ہوٹلوں کی منظری کشی بڑی خوبصورت انداز میں کرتا ہے۔

"ہال سے باہر برامدے میں قدم رکھا تو سر شام بند ہو چکی دکانوں کے آگے بنے ہوئے طویل راہداری نما برامدے میں بھی کرسی سے کرسی اور میز سے میز جڑی ہوئی تھی جہاں "منسٹری آف کریب" کے مہمان بدیسی جوڑے نفاست سے بھنے ہوئے سمندری کیکڑوں کو شراب کے گھونٹ کے ساتھ چبانے کا لطف اپنے پسندیدہ برانڈ کے سگریٹ کے دھواں دھار کش کے ساتھ اس طرح لے رہے تھے کہ اس میں کہیں کہیں محبوب کے بوسے کا تڑکا بھی تواتر سے شامل ہو رہا تھا۔ راہداری نما یہ برامدہ مستطیل شکل میں بنی ہوئی مارکیٹ کے چاروں طرف گھوم گیا تھا۔ مخدوم کے قدم وہیں رک گئے۔ ماحول میں پھیلی ہوئی تمباکو اور باربی کیو کی خوشبو کے ساتھ ساتھ اس خاموش بارش کی مہک بھی شامل ہو چکی تھی جو طویل برامدوں کے وسط میں موضود مستطیل نما ٹکڑے پر کھے آسمان سے اتر رہی تھی۔ برامدے میں بیٹھے ہوئے مست نوش اگرچہ دھیما دھیما بھگونے والی اس بارش سے خود کو بچانا نہیں چاہتے تھے مگر پھر بھی برامدے کے آگے ڈھلوانی انداز میں بنا ہوا شیڈ پوری کوشش میں تھا تیزی سے آسمان سے اتر کر دھیرے سے بدیسی جسموں پر پڑنے والی اس پھوار کے ارادوں میں مزاحم ہو سکے لیکن سمندر کی سمت سے اٹھنے والی ساحلی ہوائیں کسی نہ کسی طور بارش کی بوندوں کو ان کی منزل تک پہنچانے پر تلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔"[85]

"تھائی لینڈ کے انتہائی جنوب میں واقع جزیرہ پھوکٹ کے اطراف پھیلی ہوئی بحر ہند کی انڈیمان کہلائی جانے والی اس سمندری پٹی کے گہرے سبز پانیوں سے اٹھنے والی لہر میں نجانے کیسی سحر کاری تھی کہ اس کے ترنے اور پھر ساحل کے ساتھ ساتھ گھومنے والی سڑک کی دوسری جانب عین سمندر کے مقابل میریٹ مائی کھاؤ (Marriot's Mai Khao)ہوٹل میں اپنے کمرے تک جاتے جاتے ان دونوں کو چپ سی لگ چکی تھی۔ کچھ تو تھا کہ جو اس لہر نے بدل کر رکھ دیا تھا۔"[86]

اس ناول "منتارا" میں محمد حفیظ نے مناظر فطرت و قدرت کو خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔ مجموعی طور پر اس ناول کو دیکھے تو اس میں منظر نگاری بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس ناول کی کامیابی کا راز اس کی منظر نگاری پر ہی ہے۔

حوالہ جات

1. Websters new illustrated dictionary, allans Frederick kullen reinst ,books, INC, publishers new York Washington, D.C, 1970 ,page 628.
2. Reymond Willams by "society" Avocabulary of culture and society Fontana,1976.
www.en.wikipedia.org/wiki/society

3۔ عائشہ بیگم۔تاریخ اور سماجیات، لاہور: پرنٹ لائن پبلیشرز، 1999، ص 16،17۔

4۔ ضیاالحسن، ڈاکٹر۔اردو تنقید کا عمرانی دبستان، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ص 28۔

5۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز۔کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1989، ص 180۔

6۔ کامران کاظمی، ڈاکٹر۔اردو ناول اور عصریت، 2022، ص 52۔

7۔ سعید احمد رفیق، پروفیسر۔فن اور مطالعہ فن، ص 134۔

8۔ حامد سراج، محمد۔اشتہار انواسی، مشمولہ "کرک ناتھ"، جہلم: بک کارنر پاکستان، 2020۔

9۔ خالد فتح، محمد۔اشتہار انواسی، مشمولہ "کرک ناتھ"، جہلم: بک کارنر پاکستان، 2020۔

10۔ ارشد چہال۔ادھ ادھورے لوگ کا ادھورا کردار، بک ڈائجسٹ، محمد حفیظ نمبر، جوائی، 2020، ص 86،87

11۔ حفیظ خان، محمد۔ادھ ادھورے لوگ، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، 2018، ص 76۔

12۔ ربانی، خورشید۔محمد حفیظ خان: شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2021، ص 31۔

13۔ ایضاً، ص 36۔

14۔ حفیظ خان، محمد۔انواسی، جہلم: بک کارنر پاکستان، 2019، ص 241۔

15۔ ایضاً، ص 181۔

16۔ ایضاً، ص 182۔

17۔ ایضاً، ص 237۔

18۔ فیاض، منیر۔عالمی افسانوی بیانیے کا ارتقا اور انواسی، مشمولہ:سہ ماہی ادبیات اسلام آباد، خصوصی شمارہ،اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، جلد دوم، ص356،355۔

19۔ حفیظ خان، محمد۔انواسی، جہلم: بک کارنر پاکستان،2019، ص125۔

20۔ ایضاً، ص242۔

21۔ ایضاً، ص175۔

22۔ ایضاً، ص13۔

23۔ ایضاً، ص14۔

24۔ ایضاً، ص17۔

25۔ ایضاً، ص36۔

26۔ زین العابدین۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض اقتصادی اور مالی پہلو، دہلی: مکتبہ جامعہ ،1939ء، ص41۔

27۔ غلام اصغر خان۔ نظریہ قومیت: عالمی و مقامی تناظر، لاہور: عکس پبلی کیشنز،2022، ص191۔

28۔ ایضاً، ص20۔

29۔ ایضاً، ص123۔

30.htt://www.mukaalma.com/articale/janwaron.kay.jinsi.istehsaal.ki.jadiyat/farooq.baloch(2020 اگست 3).

31۔ حفیظ خان، محمد۔ کرک ناتھ، جہلم: بک کارنر پاکستان،2020، ص32۔

32۔ ایضاً، ص7۔

33۔ ایضاً، ص7۔

34۔ ایضاً، ص24۔

35۔ ایضاً، ص32۔

36۔ ایضاً، ص64۔

37۔ ایضاً، ص123۔

38۔ ایضاً، ص251۔

39۔ ایضاً، ص24۔

40۔ ایضاً، ص224۔

41۔ حفیظ خان، محمد۔ منتارا، لاہور، راولپنڈی: صریر پبکیشنز، 2021، ص154۔

42۔ ایضاً، ص189۔

43۔ ایضاً، ص189

44۔ ایضاً، ص190۔

45۔ ایضاً، ص89۔

46۔ ایضاً، ص128۔

47۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر۔ اصناف ادب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2003ء، ص114۔

48۔ یٰسین، محمد۔ ناول کا فن اور نظریہ، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بھارت، 2002ء، ص6۔

49۔ ایضاً، ص6۔

50۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔ اردو نثر کا فنی ارتقا، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، 1994ء، ص97۔

51۔ حسینی، علی عباس۔ اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، 1990ء۔

52۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر۔ اردو ناول تاریخ و تنقید، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، 1966ء، ص21۔

53۔ عابد علی عابد، سید۔ اصول انتقاد ادبیات، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1966ء، ص502۔

54۔ عبد السلام سندیلوی، ڈاکٹر۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ، لاہور: 1962ء، ص86۔

55۔ حسینی، علی عباس۔ اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، 2005ء، ص61۔

56۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔ اردو نثر کا فنی ارتقا، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، 1994ء، ص88۔

57۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر۔ اردو ناول تاریخ و تنقید، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، 1966ء، ص21۔

58۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔اردو نثر کا فنی ارتقا، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، 1994ء، ص91۔

59۔ احسن فاروقی و نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر۔ناول کیا ہے، لاہور: دردا کادمی، 1964ء، ص60۔

60۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر۔اردو ناول تاریخ و تنقید، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، 1966ء، ص26۔

61۔ ایضاً، ص32۔

62۔ عابد علی عابد، سید۔اصول انتقاد ادبیات، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1966ء، ص517۔

63۔ حسینی، علی عباس۔اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، 2005ء ص67۔

64۔ عابد علی عابد، سید۔اصول انتقاد ادبیات، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1966ء، ص99۔

65.http//hafeezkhan/adh.adhoreylog/sujag.org/single/rishadbukhari.

66۔ حفیظ خان، محمد۔ادھ ادھورے لوگ، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، 2018، ص10،9۔

67۔ ایضاً، ص11،10۔

68۔ ایضاً، ص12۔

69۔ ایضاً، ص20۔

70۔ ایضاً، ص22،21۔

71۔ ایضاً، ص34،33۔

72۔ ایضاً، ص84،83۔

73۔ ایضاً، ص1۔

74۔ حفیظ خان، محمد۔انواسی، جہلم: بک کارنر پاکستان، 2019، ص17۔

75۔ ایضاً، ص242۔

76۔ ایضاً، ص38،37۔

77۔ ایضاً، ص29۔

78۔ حفیظ خان، محمد۔ کرک ناتھ، جہلم: بک کارنر پاکستان، 2020، ص313۔

79۔ ایضاً، ص271،272۔

80۔ ایضاً، ص266،267۔

81۔ ایضاً، ص215۔

82۔ ایضاً، ص15۔

83۔ حفیظ خان، محمد۔ منتارا، لاہور، راولپنڈی: صریر پبلیکیشنز، 2021، ص78،79۔

84۔ ایضاً، ص114۔

85۔ ایضاً، ص7۔

86۔ ایضاً، ص9۔

مجموعی جائزہ

عصبیت سے مراد ہے کہ اپنے خاندان، قبیلے، نسل، مذہب، زبان اور علاقے کی حمایت کرنا یا طرف داری کرنا ہے۔ عصبیت سماج میں کم یا زیادہ ضرور پائی جاتی ہے کیونکہ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔

اس کائنات میں انسان اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اجتماعی زندگی کا آغاز گھر یا خاندان سے ہوتا ہے کیونکہ انسان سب سے پہلے اپنے ماں باپ اور باقی گھر والوں سے تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس طرح سے انسان کا خاندان سے قبیلے، علاقے، مذہب اور زبان کے گروہوں سے تعلقات بنتے ہیں۔ اور وہ اس طرح سماجی زندگی گزارتا ہے۔ جب انسان دنیا میں قبائلی نظام کی صورت میں رہتے تھے تو اس زمانے میں ہر فرد کا اپنے خاندان اور قبیلے سے جو مضبوط تعلق عصبیت کی وجہ سے ہی ہوتا تھا اور اگر کسی خاندان یا قبیلے کے افراد کا آپس میں تعلق کمزور ہوتا یعنی اس خاندان یا قبیلے میں عصبیت کم ہوتی تو وہ قبیلہ کمزور سمجھا جاتا۔ علامہ ابن خلدون نزدیک عصبیت خاندان، قبیلے، ملک اور مذہب کے لیے بہت لازمی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے گروہ کی مضبوطی کے لیے عصبیت کا ہونا بہت اہم ہے خاص کر وہ جو گروہ حکمرانی کرنے کا شوق رکھتا ہو۔ ابن خلدون عصبیت مراد گروہی شعور لیتے ہیں۔ مگر عصبیت کے منفی استعمال کی وجہ پیغمبرِ اسلام اس کو معاشرے کے لیے خطرناک چیز قرار دیا ہے کیونکہ لوگ ظلم اور جبر میں بھی اپنے خاندان، قبیلے، نسل، مذہب اور علاقے والوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا۔ ابن خلدون عصبیت کے مثبت استعمال کو سامنے رکھتے ہوئے اسے معاشرے کے لیے ضروری کہا ہے اور اسلام نے عصبیت کے منفی استعمال کو دیکھ کر معاشرے کے لیے خطرناک کہا ہے۔

انسانوں میں خاندان، قبیلے، نسل، مذہب، زبان اور علاقے کا امتیاز فطری طور پر مشیت الٰہی کی طرف سے ہوتا ہے کیونکہ کوئی فرد خود سے یہ راشتے قائم نہیں کرتا ہے۔ اس لیے خاندان، قبیلے، مذہب، زبان اور علاقے پر فخر کرنا انتہائی نادانی کی بات ہے۔ ان چیز کی بنیاد پر کوئی فرد خود کو برتر اور دوسرے کو کمتر سمجھتا ہے اور اپنوں کی بے جا طرف داری کرتے ہوئے دوسروں کے حقوق پر حملہ آور ہو کر ان کو حق سے محروم کر دیتا ہے۔ جیسے عرب والے زبان کی وجہ سے خود کو اعلیٰ اور باقی ساری دنیا کے لوگوں کو عجمی کہتے تھے (یعنی خود کو برتر اور دوسروں حقیر جانتے تھے)۔ اس طرح سفید نسل والے کالے رنگ والوں سے نفرت کرتے ہوئے ان پر مظالم کرتے رہے ہیں اور آج بھی کئی خطوں میں ایسا ہو رہا ہے۔ یوں ہی ہمارے برصغیر میں ذات پات کی تقسیم وغیرہ کے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں۔ اس طرح کے غلط تصورات کو عصبیت کہتے ہیں کیونکہ ان ہی کی وجہ سے فسادات کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ عصبیت کے یہ منفی فکری

و عملی مظاہرے سماج کے امن وامان کے لیے خطرہ بنتے ہیں۔اس عمل کے نتیجے میں معاشرے میں ناانصافی اور ظلم ہوتا ہے۔

اور ایک فرد یا گروہ دوسرے فرد یا گروہ سے امتیازی سلوک کرتا ہے۔ہم اپنے ارد گرد نظر ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہمیں دولت، طاقت اور حثیت میں فرق نظر آتا ہے۔کچھ طبقات ایسے ہیں جن کو دوسروں کے مقابلے میں اعلیٰ مقام اور زیادہ مراعات حاصل ہیں۔اس قسم کے عدم مساوات کو ہم سماجی عدم استحکام کا نام دیتے ہیں۔اس وجہ سے اکثر سماجی گروہوں کے خلاف غیر منصفانہ سلوک کیا جاتا ہے۔جس کو ہم امتیازی سلوک کہتے ہیں۔امتیازی سلوک بہت سی خصوصیات پر مبنی ہو سکتا ہے۔اس کا اکثر اقلیتیں اور کمزور طبقات نشانہ بنتے ہیں۔لیکن بعض اوقات اکثریت بھی اس کی زد میں آجاتی ہیں۔جیسا کہ ایک طویل عرصے تک سیاہ فام لوگ نسل امتیاز کا نشانہ بنتے رہے۔امتیازی سلوک گروپس یا افراد کو کسی نہ کسی طرح سے نقصان پہنچاتا ہے۔نسل پرستی، جنس پرستی، مذہب پرستی، ہوموفوبیا، ٹرانس فوبیا ، سیکسزم (ٹرانس جینڈر افراد کے) کلاسزم، معذوری اور سیاست وغیرہ امتیاز کی وجہ بنتے ہیں۔امتیازی سلوک اکثر عصبیت کا نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ پہلے سے ایک تشکیل شدہ منفی رویہ بعض افراد یا گروپس کو کمتر سمجھنے کی طرف لے جاتا ہے۔

امتیازی سلوک معاشرے میں عدم مساوات کو برقرار رکھتا ہے اور ایک انسان کو اپنے حق سے صرف اس لیے محروم کرتا ہے کہ اس کا تعلق کسی خاص نسل، جنس، مذہب، قوم اور زبان وغیرہ سے ہے۔جبکہ دوسرے انسان کو اپنے حق سے زیادہ نوازا جاتا ہے۔جب ہم سب انسان اس چیز کا حق رکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ نسل، جنس، مذہب، قوم ،ذات، طبقے، زبان، عمر، صنفی شناخت اور دیگر حیثیت سے قطع نظر، یکسان سلوک کیا جائے۔اس کے باوجود بھی ہر معاشرے میں یہ رویہ یا عمل پایا جاتا ہے۔جو محض مراعات یا اقتدار کے عہدوں پر ہونے والے افراد "مختلف" گروپ سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔امتیازی سلوک شروع ہی اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص اپنے انسانی حقوق یا قانونی حقوق سے مساویانہ بنیادوں پر دوسروں کے ساتھ سلوک یا قانون میں کی جانے والی بلاجواز تفریق کی وجہ سے ناخوش ہو۔دنیا بھر کی کمیونٹیز کے ساتھ کام کرتے ہوئے، ہم امتیازی قوانین اور طریقوں کو چیلنج کرتے ہیں تاکہ یہ یقینی بنایا جاسکے کہ تمام لوگ مساوی بنیادوں پر اپنے حقوق سے خوش رہ سکیں۔

عصبیتوں اور امتیازات جیسی موزی امراض سے ہمارا معاشرہ گہرا ہوا ہے۔اگر ہم اپنے ارد گرد نظر ڈال کر دیکھے تو ہمیں ہر فرد کسی نہ کسی عصبیت اور امتیاز میں مبتلا نظر آئے گا۔سماج کا سب سے حساس ترین شخص ادیب ہوتا ہے جس کی پورے سماج پر گہری نظر ہوتی ہے۔وہ معاشرے میں جنم لینے والے ناسوروں کے خلاف اپنے قلم سے آپریشن کرتا ہے۔یہ وہ ہی ادیب کر سکتا ہے جو سماج کے ارتقا کا شعور رکھتا ہو۔تاریخی شعور کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کی

درست تصویر بنانے کے لیے معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے ساتھ ساتھ نچلے طبقے کے افراد، کسانوں اور مزدروں کے صحیح حالات ان کے روزمرہ کے مسائل کی نشاندہی کی جائے اور بہتر معاشرے کی تعمیر کے لیے ان کے روزمرہ کے مسائل کا قابل قبول حل بھی پیش کیا جائے۔

محمد حفیظ ایک نامور ادبی نقاد، ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ ہیں۔ وہ اردو اور سرائیکی زبان میں اپنی تخلیقی کاوش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی تخلیقات کسی بھی زبان میں سرائیکی خطے کی عوام کے مسائل کے موضوعات کے گرد گھومتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محمد حفیظ کا تعلق سرائیکی خطے سے ہے اس لیے ان کے پاس کہانیاں بھی سرائیکی خطے کی موجود ہیں۔ محمد حفیظ سماجی شعور رکھنے والے حساس ادیب ہیں۔ ان کی کہانیاں معاشرتی زندگی کے واقعات سے بھری پڑی ہیں ان کی فکر میں انسانیت کا درد نظر آتا ہے۔ وہ حقیقی اور سچے حالات کی مکمل بصیرت رکھتے ہیں۔

محمد حفیظ کے ناول ماضی اور حال کے معاشرے کے عکاس ہیں۔ ان کے ناولوں میں عصبیت اور امتیازی سلوک کے علاوہ دوسرے سماجی مسائل بھی ملتے ہیں۔ محمد حفیظ نے اپنے ،ادھ ادھورے لوگ، انواسی اور کرک ناتھ جیسے ناولوں میں فرضی کرداروں کی مدد سے معاشرے میں موجود نسلی، مذہبی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں اور امتیازات کو پیش کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ جیسے "ادھ ادھورے لوگ" میں وادھو اور رادھی کے کردار میں مذہبی عصبیت نظر آتی ہے۔ اس طرح ناول کے مرکزی کردار فیاض میں لسانی اور علاقائی عصبیت موجود ہوتی ہے۔ ناول "انواسی" میں سیدے کے کردار میں مذہبی عصبیت ہوتی ہے اور انگریز انتظامیہ کے کردار میں معاشی عصبیت ہوتی ہے۔ اس ناول کی مرکزی کردار سنگری عورت ہونے کی وجہ سے ہمیشہ امتیازی سلوک کا نشانہ بناتی رہتی ہے۔ ناول "کرک ناتھ" میں زفیرہ احمد کا کردار صنفی امتیاز اور معاشی عصبیت کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کے ساتھ ماہین کے کردار کی صورت میں کلاس کا امتیاز نظر آتا ہے اور شبیر کا کردار سے امتیازی سلوک کہیں نہ کہیں نظر آتا ہے۔

ان ناولوں کے تجزیہ سے بات سامنے آتی ہے کہ محمد حفیظ سماج کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ سماج میں رائج خیر و شر کے پیمانوں کو سمجھتے ہیں اور پھر اپنا نکتہ ء نظر سامنے لانے کی بجائے اُن برائیوں اور خرابیوں کو نشان زد کرتے ہیں جو سماجی قدروں کی تباہی کا سبب بن رہی ہیں۔ وہ کسی طرح کا تعصب ہو، ہوس ہو یا سماجی جبر ہو، محمد حفیظ ہر صورت کو جانتے ہیں اور اسے قاری کے سامنے آشکار کرتے چلے جاتے ہیں۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

حفیظ خان، محمد۔ادھ ادھورے لوگ، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، 2018۔

حفیظ خان، محمد۔انواسی، جہلم بک کارنر پاکستان، جہلم، 2019۔

حفیظ خان، محمد۔کرک ناتھ، جہلم بک کارنر پاکستان، جہلم، 2020۔

حفیظ خان، محمد۔منتارا، صریر پبکیشنز، لاہور، راولپنڈی، 2021۔

ثانوی ماخذ

ابن خلدون، عبدالرحمان۔ مقدمہ ابن خلدون،مترجمہ:راغب رحمانی دہلوی، کراچی: نفیس اکیڈمی، 1970ء۔

ابن خلدون، عبدالرحمان۔مقدمہ ابن خلدون،مترجمہ:سیدحسن خان یوسفی، کراچی: نور محمد اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب۔

احسن فاروقی ونورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر۔ناول کیا ہے، لاہور: دردا کادمی، 1964ء۔

اسٹالن۔قوم اور قومیت، لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2020ء۔

انیتا اندسنگھ۔The partition of india، دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، 2006ء۔

حسینی، علی عباس، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، 2005۔

ربانی، خورشید۔ محمدحفیظ خان:شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2021۔

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر۔اصناف ادب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2003ء۔

زین العابدین۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض اقتصادی اور مالی پہلو، دہلی: مکتبہ جامعہ، 1939ء۔

سعید احمد رفیق، پروفیسر۔فن اور مطالعہ فن۔

سنن ابی داؤد، کتاب الادب۔

سہیل بخاری، ڈاکٹر۔اردو ناول تاریخ و تنقید، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، 1966۔

ضیاالحسن، ڈاکٹر۔اردو تنقید کا عمرانی دبستان، لاہور: پنجاب یونیوسٹی۔

عابد علی عابد، سید۔اصول انتقادادبیات، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1966۔

عائشہ بیگم۔ تاریخ اور سماجیات، لاہور: پرنٹ لائن پبلیشرز، 1999ء۔

عبدالسلام سندیلوی، ڈاکٹر۔ادب کا تنقیدی مطالعہ، لاہور: 1962ء۔

عمادی، محمد عبدالقادر۔نسل اور نسلی امتیازات، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1984ء۔

غلام اصغر خان۔نظریہ قومیت: عالمی و مقامی تناظر، لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2022ء۔

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔اردو نثر کا فنی ارتقا، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، 1994۔

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔اردو افسانہ اور افسانہ نگار، دلی: مکتبہ جامعہ، 1981ء۔

کامران کاظمی، ڈاکٹر۔اردو ناول اور عصریت، 2022ء۔

محمد ذاکر، ڈاکٹر۔آزادی کے بعد ہندوستان کا ادب، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، 1981ء۔

یٰسین، محمد۔ ناول کا فن اور نظریہ، پٹنہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری بھارت، 2002ء۔

Johann Gottlieb Fichte, Addressess to the German Nation (Chicago: Open Court,1992),p.215-

Reymond Willams by "society" Avocabulary of culture and society Fontana,1976. www.en.wikipedia.org/wiki/society-

Websters new illustrated dictionary, allans Frederick kullen reinst ,books, INC, publishers new York Washington, D.C, 1970 ,page 628.

Swami Madhavanada;R.C. Majumdar great woman at India , Imora, 1953, P,1-2.

Indra, M.A Status at woman in Ancient. India Banoras 1955,P.12.

Joggar Alison, M.Feminist Politics and Human Harvestor Pressitd(uk) 1983,P.136.

Feminism: P:1,Arpita Mukhopadhyay,Orient Blackswan 2016.

رسائل و جرائد

ارشد چہال۔ادھ ادھورے لوگ کا ادھورا کردار، بک ڈائجسٹ، محمد حفیظ نمبر، جوائی،2020۔

حامد سراج، محمد۔اشتہار انواسی، مشمولہ "کرک ناتھ"، جہلم: بک کارنر پاکستان،2020۔

خالد فتح، محمد۔اشتہار انواسی، مشمولہ "کرک ناتھ"، جہلم: بک کارنر پاکستان،2020۔

حسنین کاظمی۔اوراقِ فیض، مشمولہ: ہماری قومی ثقافت، کراچی: ادارہ یادگارِ غالب،1976ء۔

سید احمد خان، سر۔انتخاب مضامین سر سید، ریختہ ویب سائٹ۔

فیاض، منیر۔عالمی افسانوی بیانیے کا ارتقا اور انواسی، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات اسلام آباد، خصوصی شمارہ، اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، جلد دوم۔

htt://www.mukaalma.com/articale/janwaron.kay.jinsi.istehsaal.ki.jadiyat/farooq.baloch(2020 اگست 3).

http//hafeezkhan/adh.adhoreylog/sujag.org/single/rishadbukhari.

Pascoe, E. A. & Richman, L. S. (2009). Perceived discrimination **and** health: A meta-analytic review. Psychological Bulletin 135(4): 531-554. Doi: 10.1037/a0016059-

https://www3.ohrc.on.ca/ur/ur/%D9%86%D8%B3%D9%84%DB%8C-1%D8%A7%D9%85%D8%AA%DB%8C%D8%A7%D8%B2-racial-discrimination

لغات

1۔ دہلوی، مولوی سید احمد۔فرہنگ آصفیہ، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو،1967ء۔

2۔ ریختہ، اردو ڈکشنری ایپ۔